معارف

اپریل ۲۰۱۶ء

مجلس دارالمصنّفین کا ماہوار علمی رسالہ

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ

سالانہ زرتعاون

ہندوستان میں سالانہ ۲۸۰/روپئے۔ فی شمارہ ۲۵/روپئے۔ رجسٹرڈ ڈاک ۴۸۴/روپئے

دیگر ممالک میں سادہ ڈاک ۱۶۶۰/روپئے۔ دیگر ممالک رجسٹرڈ ڈاک ۱۷۸۰/روپئے

ہندوستان میں ۵ سال کی خریداری صرف ۱۳۰۰/روپئے میں دستیاب۔

(اوپر کی رقوم ہندوستانی روپئے میں دی گئی ہیں)

پاکستان میں ماہنامہ معارف کے لئے رابطہ کریں

سجاد الٰہی صاحب، 27-A لوہا مارکیٹ، مال گودام روڈ، بادامی باغ، لاہور (پاکستان)

Tel: 0300 - 4682752, (R) 5863609, (O) 7280916

Email: abdulhadi_133@yahoo.com

سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔ بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں۔

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY, AZAMGARH

- زرتعاون ختم ہونے پر تین ماہ کے بعد رسالہ بند کردیا جائے گا۔
- معارف کا زرتعاون وقت مقررہ پر روانہ فرمائیں۔
- خط وکتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔
- معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔
- کمیشن ۲۵ فیصد ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہئے۔

مقالہ نگار حضرات سے التماس

- مقالہ صفحہ کے ایک طرف لکھا جائے۔
- حواشی مقالے کے آخر میں دیئے جائیں۔
- مآخذ کے حوالہ جات مکمل اوراس ترتیب سے ہوں: مصنف یا مؤلف کا نام، کتاب کا نام، مقام اشاعت، سن اشاعت، جلد یا جزاور صفحہ نمبر۔

عبدالمنان ہلالی (جوائنٹ سکریٹری رمنیجر) نے معارف پریس میں چھپوا کر
دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ سے شائع کیا۔

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کا علمی ودینی ماہنامہ

معارف

جلد نمبر ۱۹۷ ماہ رجب المرجب ۱۴۳۷ھ مطابق اپریل ۲۰۱۶ء عدد ۴

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی
پوسٹ بکس نمبر: ۱۹
شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یوپی)
پن کوڈ: ۲۷۶۰۰۱

فہرست مضامین

شذرات

معارف کی اشاعت بہت زیادہ کبھی نہیں رہی۔بعض اوقات کسی حدتک قابل اطمینان رہی تو بعض اوقات پریشان کن حدتک کم۔اس طرح کے خالص علمی رسائل کو عام طور پر اسی طرح کی صورت حال کا سامنا کرنا پڑتا ہے اوراسی وجہ سے ان میں سے بیشتر کی زندگی کا دورانیہ بہت مختصر ہوتا ہے۔معارف کے سلسلہ میں اہم بات یہ ہے کہ تمام تر موانع اور مشکلات کے باوجود اس کا علمی اور تحقیقی سفر جاری رہا اور وہ عظیم الشان کامیابی حاصل کرنے میں کامیاب ہوا جو ان حالات میں بظاہر ناقابل حصول نظر آتی تھی۔بارگاہ ایزدی سے اس کے لیے یہ امتیاز مخصوص کر دیا گیا تھا کہ ایک صدی کا طویل سفر طے کرنے والا وہ پہلا اردو رسالہ ہو۔یہ نہ صرف دارالمصنّفین اور معارف کے لیے ایک غیر معمولی واقعہ ہے بلکہ اردو صحافت کی تاریخ میں بھی اس کی حیثیت ایک سنگ میل کی ہے۔اس تاریخی موقع کو یادگار بنانے کے سلسلہ میں دارالمصنّفین کے سامنے جو منصوبے ہیں ان کی تفصیل گذشتہ شمارہ میں پیش کی جاچکی ہے۔ان کے علاوہ اس موقع کی مناسبت سے معارف کی توسیعِ اشاعت کے لیے بھی ایک بھرپور کوشش پیش نظر ہے۔معارف کے قدردانوں اور دارالمصنّفین کے بہی خواہوں سے التماس ہے کہ وہ اس مہم میں دامے، درمے، قدمے، سخنے ہر طرح سے مدد فرمائیں۔ہماری درخواست ہے کہ معارف کا ہر قدرداں کم ازکم ایک نیا خریدار فراہم کرے۔علم دوست اصحاب خیر کو آمادہ کیا جائے کہ وہ رسالہ کی لائف ممبرشپ قبول فرمائیں جو دس ہزار روپیہ ہے۔اگر یہ ممکن نہ ہو تو کم ازکم پانچ سال کی خریداری قبول فرمائیں جس کا زر اشتراک تیرہ سو روپیہ ہے۔پہلے سے ممبر بن جانے والوں کی خدمت میں جون میں شائع ہونے والا خاص نمبر بھی تحفۃً پیش کیا جائے گا۔معارف صدی کے سلسلہ میں جو منصوبے پیش نظر ہیں ان کی تکمیل کے لیے کثیر رقم کی ضرورت ہوگی۔اگر ایک مناسب تعداد لائف ممبرشپ قبول کرلے تو کسی حدتک اس ضرورت کو پورا کیا جاسکتا ہے۔یہ دارالمصنّفین کے ساتھ ایک بڑا تعاون بھی ہوگا، معارف کی خدمات کا اعتراف بھی اور اس کی قدردانی کا ثبوت بھی۔

شبلی صدی سال ختم ہوئے اب کئی مہینے گذر چکے ہیں لیکن علامہ شبلی کو خراج عقیدت پیش

کرنے اوران کی علمی اور ملی خدمات کو یاد کرنے کا سلسلہ ابھی جاری ہے۔ عام طور پر ہم اپنے محسنوں کو یاد کرنے کے معاملہ میں کچھ زیادہ حسّاس واقع نہیں ہوئے ہیں لیکن علامہ شبلی اس قاعدہ میں استثناء کا حکم رکھتے ہیں۔ گذشتہ پورے سال ملک کے مختلف حصوں میں اور بیرون ملک بھی کئی جگہوں پر اس موضوع پر سیمیناروں اور مذاکروں کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ ان میں سے بعض میں ان کو اور مولانا حالی کو ساتھ ساتھ یاد کیا گیا لیکن زیادہ تر یہ مجالس علامہ شبلی کے ساتھ مخصوص رہیں۔ گذشتہ سال کے اختتام تک اس سلسلہ میں منعقد ہونے والے پروگراموں کی تفصیل ان صفحات میں فراہم کی جاتی رہی ہے۔ جو پروگرام اس کے بعد منعقد ہوئے ان کی تفصیل پیش خدمت ہے:

۱۔ حالی اور شبلی ۔ ہندوستان کے دو روشن دماغ۔ ۲۴۔۲۵ رفروری ۲۰۱۶ء، شعبہ اردو، تلنگانہ یونیورسٹی، نظام آباد بہ اشتراک قومی کونسل برائے فروغ اردو۔

۲۔ علامہ شبلی نعمانی ۔ حیات و خدمات۔ ۶/ مارچ ۲۰۱۶ء، شعبہ اردو و عربی، اسلامیہ کالج، وانمباڑی۔

۳۔ علامہ شبلی نعمانی ۔ فن اور شخصیت۔ ۲۰/ مارچ ۲۰۱۶ء، ایف۔ ڈی آرٹس، کامرس اینڈ سائنس کالج فار ویمن، جمال پور، احمد آباد بہ اشتراک گجرات اردو ساہتیہ اکادمی، گاندھی نگر، گجرات۔

ہریانہ میں تھانیسر، کرنال، پانی پت اور دوسرے بے شمار شہر اور قصبات صدیوں تک اسلامی تہذیب و تمدن کا گہوارہ رہے۔ لیکن تقسیم ملک کے بعد یہ صورت حال یکسر بدل گئی۔ ان علاقوں سے بڑے پیمانے پر مسلمانوں کی نقل مکانی کی وجہ سے ان کی شکل و صورت ہی بدل گئی۔ مسجدیں بے چراغ ہوگئیں اور مدرسے اور خانقاہیں ویران ہوگئیں۔ وہ روایات جو صدیوں سے ان کی شناخت کی حیثیت رکھتی تھیں اس حد تک اجنبی ہوگئیں کہ ان کا کوئی جاننے والا نہ رہا۔ ہندوستان کی تاریخ کا رخ بدلنے والی تین جنگوں کی شہرت رکھنے والا بوعلی شاہ قلندر کا پانی پت جس نے مولانا الطاف حسین حالی جیسے یگانہ روزگار کو جنم دیا اور جہاں ان کی آخری آرام گاہ بھی ہے، ان کے نام اور کام سے یکسر ناواقف ہوگیا۔ ان صفحات میں یہ ذکر ہو چکا ہے کہ علامہ شبلی اور شبلی اکیڈمی کے ایک شیدائی راجیو رنجن کی کوششوں سے اہل پانی پت کے لیے مولانا حالی کی بازیافت کا خوش گوار سلسلہ

شروع ہوا۔ان کی دلچسپی اورکوشش سے ۹-۱۰/اگست ۲۰۱۴ءکوسناتن دھرم پوسٹ گریجویٹ کالج، پانی پت میں ''اسمرتی کے سوسال - حالی اورشبلی'' کے موضوع پرایک دوروزہ سیمینار کا اہتمام کیا گیا تھا۔اس سیمینار کے مطالبہ کوتسلیم کرتے ہوئے ہریانہ گورنمنٹ نے مولانا حالی کے نام پر پانی پت میں ایک یونیورسٹی کے قیام کومنظوری دی اورخود کالج نے حالی چیر قائم کرنے کا اعلان کیا۔ریاست میں حکومت کی تبدیلی کی وجہ سے یونیورسٹی کے قیام کا مسئلہ توتعویق میں پڑ گیا ہےلیکن خوشی کی بات ہے کہ سناتن دھرم کالج نے اپنا وعدہ پورا کردیا۔اس کے لائق،فعّال اورروشن خیال پرنسپل ڈاکٹر انوپم ارورا کی دلچسپی اورکوشش سے یہ خواب تعبیر آشنا ہوا اور ۲۰/مارچ ۲۰۱۶ءکوایک باوقار تقریب میں اس کا افتتاح ہوا۔اس موقع پر جولوگ موجود تھے ان میں پنجاب اردو اکادمی کے جناب شمس تبریزی بھی شامل تھے۔اس کی حیثیت مطالعات مولانا حالی کے مرکز کی ہوگی۔اس مرکز میں مولانا حالی اور علامہ شبلی کی تصانیف اوران سے متعلق کتابوں کوخاص طور سے جمع کیا جائے گا اوران سے متعلق موضوعات پر مطالعہ وتحقیق کے لیے سازگار ماحول پیدا کیا جائے گا۔خاص بات یہ ہے کہ شروع ہی سے اس پورے پروگرام میں مولانا حالی کے ساتھ علامہ شبلی اور پانی پت کے ساتھ اعظم گڑھ کا نام شامل رہا ہے۔ان اساتذہ اورطلبہ وطالبات کے لیے اردو کی تدریس کا بھی انتظام کیا جائے گا جوان بزرگوں کی تصانیف کوپڑھنا اوران کے افکار سے آگاہی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ان کی تعلیمات اور افکارکو عام کرنے کے مقصد سے سال میں کئی پروگرام کا انعقاد کیا جائے گا اور یہ اکیڈمک کیلنڈر کا باقاعدہ حصہ ہوں گے۔منافرت،عدم تحمل اورعدم رواداری کی موجودہ تاریک فضا میں اس اقدام کی حیثیت ایک روشن چراغ کی ہے۔یہ ایک نہایت قابل تحسین اوراہم پہل ہےاوریقین ہے کہ اس کے دوررس نتائج مرتب ہوں گے۔مجھے خوشی ہے کہ اس اہم تاریخی لمحہ کا میں بھی گواہ تھااورجب پانی پت میں وسیع النظری اورباہمی مفاہمت اوررواداری کی ایک نئی تاریخ لکھنے کی ابتدا ہورہی تھی تواس کوشش میں میں بھی شریک تھا۔اس خصوصی تعلق کی وجہ سے جودونوں بزرگوں کے درمیان تھا شبلی اکیڈمی کے اس خادم کواس تقریب میں مہمان خصوصی کی عزت بخشی گئی۔اس موقع پراکیڈمی کی مولانا حالی سے متعلق دومطبوعات کواس مرکز کے پہلے اثاثہ کے طور پر پیش کیا گیا۔کیسی حسرت کا مقام ہے کہ جوکام ہمارے ادارے نہ کرسکے اس کوپورا کرنے کا اعزاز سناتن دھرم پوسٹ گریجویٹ کالج کوحاصل ہوا۔

مقالات

اقبال کا تصور خودی

جناب الطاف احمد اعظمی

(۲)

کلام اقبال کی روشنی میں خودی کا مفہوم: انسانی خودی کی مذکورہ بالا تشریحات کے بعد ضروری ہوجاتا ہے کہ خود علامہ اقبال کی طرف رجوع کیا جائے اور ان کی نظم و نثر دونوں کو غور و تحقیق کی نظر سے دیکھا جائے کہ ان سے خودی کے اس مفہوم کی تائید ہوتی ہے یا نہیں؟ اور کیا اقبال کے تصور خودی میں دوسرے مفاہیم بھی پائے جاتے ہیں؟

علامہ اقبال کے اردو اور فارسی کلام کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے تصور خودی میں دو مفہومات بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ ایک خودی بہ معنی نفسی طاقت و قوت اور دوسرا خودی بہ معنی خدا۔ اس دوسرے مفہوم کو اقبال نے بہ تکرار اور زور و شدت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ خودی کا ایک تیسرا مفہوم بھی ان کے کلام میں جا بجا ملتا ہے اور وہ خودی بہ معنی غیرت و خودداری اور اولوالعزمی ہے۔ ہم خودی کے ان تینوں مفہومات کو بالترتیب بیان کرتے ہیں:

۱۔ فارسی زبان میں اقبال کی اولین شعری تصنیف ''اسرار خودی'' ہے۔ اس کا سال تالیف ۱۹۱۵ء ہے۔ اس کے دیباچہ میں وہ لکھتے ہیں ''یہ پراسرار شے جو فطرت انسانی کی منتشر اور غیر محدود کیفیتوں کی شیرازہ بند ہے۔ یہ خودی یا ''انا'' یا ''میں'' جو اپنے عمل کی رو سے ظاہر اور اپنی حقیقت کی رو سے مضمر ہے، جو تمام مشاہدات کی خالق ہے مگر جس کی لطافت مشاہدے کی گرم نگاہوں کی تاب نہیں لاسکتی، یہ کیا چیز ہے؟ کیا یہ ایک لازوال حقیقت ہے یا زندگی نے محض عارضی طور پر اپنی فوری عملی اغراض

آر زیڈ۔ ۹۰۱ بی، فلیٹ نمبر ۴۰۲، لین نمبر ۲۴، تغلق آباد ایکسٹنشن، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۹۔

کے حصول کی خاطر اپنے آپ کو اس فریب تخیل کی صورت میں نمایاں کیا ہے؟...... دنیا کی کوئی قوم ایسی نہ ہوگی جس کے حکماء وعلماء نے کسی نہ کسی صورت میں اس سوال کا جواب دینے کے لیے دماغ سوزی نہ کی ہو...... مشرق کی فلسفی مزاج قومیں زیادہ تر اسی نتیجے کی طرف مائل ہوئیں کہ انسانی انا محض ایک فریب تخیل ہے اور اس پھندے کو گلے سے اتار دینے کا نام نجات ہے۔ مغربی اقوام کا عملی ذوق ان کو ایسے نتائج کی طرف لے گیا جس کے لیے ان کی فطرت متقاضی تھی۔ ہندو حکماء نے مسئلہ وحدت الوجود میں دماغ کو اپنا مخاطب بنایا لیکن ایرانی شعراء نے اس مسئلہ کی تفسیر میں دل کو اپنی آماج گاہ بنایا اور ان کی حسین وجمیل نکتہ آفرینیوں کا آخر کار نتیجہ یہ ہوا کہ اس مسئلہ نے عوام تک پہنچ کر تمام اسلامی اقوام کو ذوق عمل سے محروم کردیا...... اس مثنوی میں انا کی حقیقت کی وضاحت میں شاعرانہ تخیل محض ایک ذریعہ ہے اس حقیقت کی طرف توجہ دلانے کا کہ لذت حیات انا کی انفرادی حیثیت، اس کے اثبات واستحکام اور توسیع سے وابستہ ہے۔

اس دیباچے سے یہ بات تو بالکل واضح ہے کہ اقبال تصوف کے اس خیال کے خلاف تھے کہ انسان کا کمال اور اس کی فوز وفلاح اس بات میں ہے کہ وہ اپنی ''انا'' کو مختلف طریقوں سے مٹا کر ''انائے مطلق'' (خدا) میں ضم کردے۔ اس کے برخلاف وہ انفرادی انا کے اثبات واستحکام اور اس کی توسیع کے قائل تھے یعنی بقائے خودی کو ضروری خیال کرتے تھے۔ لیکن علامہ نے اس بات کی وضاحت نہیں فرمائی کہ خود خودی یا ''انا'' کیا چیز ہے؟ اس سوال کو انہوں نے دیباچے میں اٹھایا لیکن اس کا جواب نہیں دیا اور بات ''لذت حیات'' تک محدود ہوکر رہ گئی۔ شاید انہوں نے ایسا بالقصد کیا ہے۔

اقبال نے پروفیسر نکلسن کو ان کے استفسار کے جواب میں جو مکتوب لکھا اس میں بھی مذکورہ بنیادی سوال سے صرف نظر کرکے محض یہ بتایا کہ انسان کا اخلاقی اور مذہبی نظریہ اثبات انا ہے نہ کہ نفی انا۔ مکتوب ملاحظہ ہو:

"Obviously the view of man and universe is opposed to that of the English neo-Hegelians as well as to all forms of pantheistic sufism which regards absorption in a universal life or soul as the final aim and salvation of

man. The moral and religious ideology of man is not self-negation but self-affirmation." (17)

اس مکتوب کی روشنی میں یہ کہنا بالکل درست ہوگا کہ ''اسرار خودی'' کے زمانہ تصنیف تک اقبال خودی سے نفس انسانی میں مضمر قوت کا اثبات واستحکام مراد لیتے تھے۔ اس سلسلے میں ان کا درج ذیل خط جو انہوں نے مولوی ظفر احمد صدیقی کو لکھا تھا، بڑی اہمیت رکھتا ہے:

''دین اسلام جو ہر مسلمان کے عقیدہ کی رو سے ہر شے پر مقدم ہے، نفس انسانی اور اس کی مرکزی قوتوں کو فنا نہیں کرتا بلکہ ان کے عمل کے لیے حدود معین کرتا ہے۔ ان حدود کے معین کرنے کا نام اصطلاح اسلام میں شریعت یا قانون الٰہی ہے۔ خودی خواہ مسولینی کی ہو، خواہ ہٹلر کی، قانون الٰہی کی پابند ہو جائے تو مسلمان ہو جاتی ہے۔ مسولینی نے حبشہ کو محض جوع الارض کی تسکین کے لیے پامال کیا۔ مسلمانوں نے اپنے عروج کے زمانے میں حبشہ کی آزادی کو ملحوظ رکھا۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ پہلی صورت میں خودی کسی قانون کی پابند نہیں، دوسری صورت میں قانون الٰہی اور اخلاق کی پابند ہے۔ بہر حال حدود خودی کے تعین کا نام شریعت ہے اور شریعت کو اپنے قلب کی گہرائیوں میں محسوس کرنے کا نام طریقت (۱۸) ہے اور جب احکام الٰہی خودی میں اس حد تک سرایت کر جائیں کہ خودی کے پرائیویٹ امیال و عواطف باقی نہ رہیں اور صرف رضائے الٰہی اس کا مقصود ہو جائے تو زندگی کی اس کیفیت کو بعض اکابر صوفیائے اسلام نے فنا کہا ہے (۱۹)۔ بعض نے اسی کا نام بقا رکھا ہے''۔ (۲۰)

اقبال نے خودی کے مذکورہ بالا مفہوم یعنی خودی بہ معنی نفسی قوت کو ''اسرار خودی'' میں شرح و بسط کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس مثنوی کا آغاز مولانا روم کے درج ذیل اشعار سے ہوتا ہے:

دی شیخ با چراغ ہمہ گشت گرد شہر کز دام و دد ملولم و انسانم آرزوست
زیں ہم رہان سست عناصر دلم گرفت شیر خدا و رستم دستانم آرزوست
گفتم کہ یافت می نشود جستہ ایم ما گفت آنکہ یافت می نشود آنم آرزوست

ان اشعار کا منظوم ترجمہ ملاحظہ ہو:

کل شہر میں چراغ لیے پھر رہا تھا شیخ کہتا تھا ناکسوں میں اک انساں کی ہے تلاش
دل بجھ گیا ہے سست رفیقانِ راہ سے شیر خدا و رستم دستاں کی ہے تلاش
میں نے کہا کہ ڈھونڈ کے ہم تھک رہے اسے کہنے لگا کہ ایسے ہی انساں کی ہے تلاش (۲۱)

اس آغاز کلام سے بالکل واضح ہے کہ آگے خودی کا جو مفہوم بیان کیا گیا ہے وہ نفسی قوت کے معنی میں ہے۔ مثلاً ؎

چوں زمین بر ہستی خود محکم است ماہ پابند طواف پیہم است
ہستی مہر از زمین محکم تراست پس زمین مسحور چشم خاور است
جنبش از مژگاں برد شان چنار مایہ دار از سطوت او کوہسار
تار و پود کسوت او آتش است اصل او یک دانۂ گردن کش است
چوں خودی آرد بہم نیروی زیست می کشاید قلزمی از جوی زیست
(اسرار خودی)

''چونکہ زمین کا وجود اپنی جگہ محکم ہے اس لیے چانداس کے گرد مسلسل گردش کے لیے مجبور ہے۔سورج کا وجود زمین کے وجود سے محکم تر ہے اس لیے زمین چشم خاور سے مسحور ہے (یعنی اس کی مطیع ہے)۔چنار کے درخت کی شان دیکھو کہ آنکھ اس کو دیکھ کر حیرت کرتی ہے۔کوہسار اس کی سطوت سے ذی آن اور مایہ دار ہے۔اس کے لباس کے تار و پود سے آگ کا وجود ہے۔اس کی اصل ایک دانہ ہے جو مغرور ہے۔جب خودی زندگی کی قوت کو مجتمع کرتی ہے تو جوئے حیات کو ایک قلزم میں تبدیل کر دیتی ہے''۔

یہ اشعار بھی ملاحظہ ہوں:

غافل از حفظ خودی یک دم مشو ریزۂ الماس شو ، شبنم مشو
پختہ فطرت صورت کہسار باش حامل صد ابر دریا بار باش
خویش را دریاب از ایجاب خویش سیم شو از بستن سیماب خویش
(اسرار خودی)

''اپنی خودی کی حفاظت سے ہرگز غافل نہ ہو۔ہیرے کا ٹکڑا بنو، شبنم نہ بنو، پہاڑ کی طرح پختہ فطرت اور

ابر دریا بار کی مانند بنو۔ ایجاب ذات سے خود کو دریافت کرو اور اپنے سیماب (وجود) کی بندش سے سونا بنو‘‘۔

چونکہ عجمی تصوف خودی کے اس مفہوم کا مخالف ہے یعنی وہ نفی خودی کی تعلیم دیتا ہے اس لیے اقبال نے مسلمانوں کو دعوت دی کہ وہ ایرانی اسلام کو چھوڑ کر عربی اسلام کی طرف واپس ہوں جو انہیں عزم و ہمت اور جہد و عمل کی تعلیم دیتا ہے۔ اسرار خودی کے درج ذیل اشعار ملاحظہ ہوں ؎

فکر صالح در ادب می بایدت رجعتے سوئے عرب می بایدت

از چمن زار عجم گل چیدہ ای نوبہار ہند و ایران دیدہ ای

اندکے از گرمی صحرا بخور بادۂ دیرینہ از خرما بخور

’’تمہیں چاہیے کہ ادب میں فکر صالح تلاش کرو اور اس غرض سے عرب کی طرف رجعت کی ضرورت ہے۔ تم عجم کے چمن زار سے پھول چن چکے ہو اور ہند و ایران کی بہار دیکھ چکے ہو۔ اب تھوڑی گرمی صحرا بھی کھاؤ اور خرما سے کشیدہ پرانی شراب (کے دو چار گھونٹ) پیو‘‘۔

’’رموز بے خودی‘‘ میں حضرت شیخ احمد رفاعی کے حوالے سے ہے ؎

با مریدے گفت اے جان پدر از خیالات عجم باید حذر

زانکہ فکرش گرچہ از گردوں گزشت از حد دین نبی بیروں گزشت

قلب را زیں حرف حق گرداں قوی با عرب در ساز تا مسلم شوی

’’انہوں نے اپنے ایک مرید سے کہا، اے جان پدر! عجم کے خیالات سے پرہیز کرو۔ اس بنا پر کہ اس کی فکر گرچہ آسمان سے بڑھ کر بلند ہے لیکن اس بلند پروازی میں وہ نبیؐ کے دین کی حدود سے باہر نکل گیا ہے۔ اپنے قلب کو اس ’’حرف حق‘‘ سے قوی کرو یعنی عرب سے اپنا تعلق مضبوط کرو تا کہ تم مسلمان بن جاؤ‘‘۔

اقبال نے مسلم قوم کو اس راز سے بھی آگاہ کیا کہ خودی کی نشوونما، اس کا استحکام اور اس کی توسیع کے تین ذریعے ہیں، ایک مقصد کوشی، دوسرا آرزو اور تیسرا ذریعہ عشق یعنی مقصد سے گہرا قلبی و ذہنی لگاؤ اور اس کے حصول کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دینے کا جذبہ۔ اشعار ذیل ملاحظہ ہوں ؎

اے ز راز زندگی بیگانہ خیز از شراب مقصدی مستانہ خیز

مقصدی مثل سحر تابندہ ای ماسوا را آتش سوزندہ ای

ما ز تخلیق مقاصد زندہ ایم از شعاع آرزو تابندہ ایم

(اسرارخودی)

''اے راز زندگی سے بے خبر، اٹھو اور شراب مقصد پی کر مستانہ اٹھو، تم ایک مقصد کے حامل بن کر مثل سحر چمکو اور اس کے سوا ہر چیز کو نذر آتش کر دو، ہم مقاصد کی تخلیق سے زندہ اور شعاع آرزو سے تابندہ ہیں''۔

فطرت او آتش اندوزد ز عشق عالم افروزی بیاموزد ز عشق
عشق را از تیغ و خنجر باک نیست اصل عشق از آب و باد و خاک نیست
از نگاہ عشق خارا شق شود عشق حق آخر سراپا حق شود

(اسرارخودی)

''اس کی یعنی خودی کی فطرت عشق سے بھڑک اٹھتی ہے، عشق سے وہ عالم کو روشن کرنے کا سبق سکھاتی ہے۔ عشق کو تیغ و خنجر سے کوئی خوف نہیں، عشق کی اصل پانی، ہوا اور مٹی سے نہیں، عشق کی نگاہ سے سخت پتھر ٹوٹ جاتا ہے، عشق حق بالآخر مکمل طور پر حق بن جاتا ہے''۔

اقبال اس نکتہ سے بھی مسلمانوں کو آگاہ کرتے ہیں کہ کسی قوم کے لیے نامساعد حالات اس کی خودی کی ترقی اور بالآخر کامیابی کا زینہ بنتے ہیں، اس لیے اگر دشمن قوی ہو تو اس سے گھبرانا نہیں چاہیے بلکہ اس کا استقبال کرنا چاہیے ؂

راست می گویم، عدو ہم یار تست ہستی او رونق بازار تست
ہر کہ دانائے مقامات خودی است فضل حق داند اگر دشمن قوی است

(اسرارخودی)

''میں سچ کہتا ہوں کہ دشمن بھی تیرا دوست ہے۔ اس کا وجود تیرے بازار (زندگی) کی رونق ہے۔ جو شخص مقامات خودی سے آگاہی رکھتا ہے وہ قوی دشمن کو حق تعالیٰ کا فضل و کرم سمجھتا ہے''۔

اقبال نے ''رموز بے خودی'' میں بھی جس کا سال تالیف ۱۹۱۸ء ہے، خودی کو نفسی طاقت و قوت کے مفہوم میں لیا ہے۔ ''اسرار خودی'' میں جیسا کہ اوپر ذکر ہوا، انفرادی انا کا اثبات، اس کا استحکام اور اس کی توسیع کی تفصیل ہے اور ''رموز بے خودی'' میں قومی انا کا اثبات و استحکام اور اس کی توسیع کا بیان ہے۔ قومی انا یعنی قومی طاقت و قوت کے استحکام کی ایک ہی صورت ہے کہ انفرادی اناؤں کو ''ملی انا'' کے تابع کر دیا جائے۔ تمثیل کے اسلوب میں یوں کہہ لیں کہ انفرادی انا اگر قطرہ

ہے تو ''ملی انا'' دریا ہے۔ اگر قطرے دریا میں مل جائیں تو نہ صرف ان کی خودی (وجود) کا تحفظ ہوگا بلکہ ملی دریا کی عظمت وشوکت اور اس کی تلاطم خیزی بہت بڑھ جائے گی۔ لیکن انفرادی اناؤں کا ملی انا میں انضمام اس آئین کے مطابق ہونا ضروری ہے جس کا نام قرآن مجید ہے۔

اہل علم جانتے ہیں کہ قرآن مجید کا مغز و جوہر توحید ہے۔ اقبال نے ''رموز بے خودی'' میں اس نکتہ کو بہ تکرار نمایاں کر کے مسلم قوم کو بتایا ہے کہ یہی اس کا دین، اس کی حکمت، اس کا آئین اور اس کی قوت کا سرچشمہ ہے۔ خودی کی تقویم اس کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اشعار ذیل دیکھیں ؎

دیں ازو، حکمت ازو، آئین ازو زور ازو، قوت ازو، تمکین ازو

یک شود توحید را مشہود کن غائبش را از عمل موجود کن

لذت ایمان فزاید در عمل مردہ آں ایماں کہ ناید در عمل

''ایک ہو جاؤ اور توحید کو قابل مشاہدہ بناؤ، اس کے پوشیدہ حقائق کو اپنے عمل سے ظاہر کرو، عمل سے ایمان کی لذت میں اضافہ ہوتا ہے، وہ ایمان مردہ ہے جو عمل کی صورت اختیار نہ کرے''۔

۲۔ ''اسرار خودی'' اور ''رموز بے خودی'' کی تصنیف کے بعد مختلف عوامل کے زیر اثر جس میں مولانا روم کی فکر و اتباع کا سب سے زیادہ حصہ ہے، اقبال کی تعبیر خودی میں خودی بہ معنی خدا کا تصور نمایاں سے نمایاں تر ہوتا گیا ہے۔ سب سے پہلے انہوں نے اس خیال کا اظہار کیا کہ خودی دراصل ایک نور ہے۔

درون سینۂ آدم چہ نور است چہ نور است ایں کہ غیب او حضور است

بخاک آلودہ و پاک از مکان است بہ بند روز و شب پاک از زمان است

(زبور عجم: گلشن راز جدید)

''آدم کے سینہ کے اندر یہ کیسا نور ہے کہ پوشیدہ رہ کر بھی ظاہر و باہر ہے، اگرچہ (بظاہر) خاکی ہے لیکن (درحقیقت) وہ مکان نہیں رکھتا، اسی طرح (بظاہر) روز و شب کی بندش میں ہے لیکن زمانے سے پاک اور بلند ہے''۔

پھر ایک قدم آگے بڑھ کر یہ انکشاف کیا کہ یہ نور درحقیقت ''نور کبریائی'' ہے ؎

خودی روشن ز نور کبریائی است رسائی ہائے او از نارسائی است

جدائی از مقامات وصالش وصالش از مقامات جدائی است

(ارمغان حجاز)

''خودی نور کبریای (یعنی خدا کے نور) سے روشن ہے، اس کا ادراک دراصل عدم ادراک ہے، (اصل سے) اس کی جدائی (حقیقی نہیں ہے بلکہ) اس کے وصال کے مقامات میں سے ایک مقام ہے، اسی طرح اس کا وصال جدائی کے مقامات میں سے ایک مقام ہے (یعنی وہ اصل سے مل کر بھی اس سے جدا رہتی ہے)''۔

اقبال ابھی تک احتیاط کا دامن تھامے ہوئے تھے۔ چنانچہ انہوں نے بتایا کہ یہ ''نور کبریائی'' خدا کا محض ایک جزء ہے جو اس سے جدا ہو کر انسان کے باطن میں روپوش ہے اور جزو کل دونوں اس جدائی سے مضطرب اور ایک دوسرے سے ملنے کے لیے بے تاب ہیں ؎

ما از خدائی گم شدہ ایم او بہ جستجوست چوں ما نیاز مند و گرفتار آرزوست

گاہے بہ برگ لالہ نویسد پیام خویش گاہے درون سینۂ مرغاں بہ ہاؤ ہوست

ہنگامہ بست از پئے دیدار خاکئے نظارہ را بہانہ تماشائے رنگ و بوست

در خاک دان ما گہر زندگی گم است ایں گوہرے کہ گم شدہ مائیم یا کہ اوست

(زبور عجم)

''ہم خدا سے دور اور گم کردہ ہیں اور وہ ہماری جستجو میں ہے۔ وہ بھی ہماری طرح نیاز منداور گرفتار آرزو ہے۔ وہ کبھی برگ لالہ پر اپنا پیام لکھتا ہے اور کبھی مرغان خوش نوا کے سینے میں ہاؤ ہُو کی صورت میں خود کو ظاہر کرتا ہے۔ محض آدم خاکی کے دیدار کے لیے اس نے یہ ہنگامہ (عالم) بپا کیا ہے۔ یہ تماشائے رنگ و بو دیدار کا ایک بہانہ ہے۔ ہماری دنیا میں گہر زندگی کھو گیا ہے۔ یہ گوہر گم شدہ ہم ہیں یا وہ''۔

لیکن آگے چل کر اقبال نے جزو کل کے فرق کو ختم کر دیا اور صاف لفظوں میں کہا کہ خودی بھی خدا کی طرح بقا کی صفت رکھتی ہے، دوسرے لفظوں میں خودی اور خدا دونوں ایک ہی وجود مطلق کے دوروپ ہیں۔ ظاہر میں جو خاکی وجود بہ صورت انسان نظر آتا ہے وہ بہ باطن خدا ہے ؎

جہان دل جہان رنگ و بو نیست درو پست و بلند و کاخ و کونیست

زمین و آسمان و چار سو نیست دریں عالم بجز اللہ ہو نیست

(ارمغان حجاز)

"دل کی دنیا، عالم رنگ و بو سے مختلف ہے۔ اس میں کہیں پست و بلند اور کاخ و کو نہیں، اس میں زمین و آسمان اور چار سو نہیں، اس عالم (یعنی عالم دل) میں اللہ کے سوا کوئی اور موجود نہیں ہے"۔

خودی کا یہ بدلا ہوا مفہوم اقبال کے اردو کلام میں بھی جا بجا ملتا ہے۔ "بال جبریل" کی مشہور نظم "ساقی نامہ" کے درج ذیل اشعار ملاحظہ ہوں ؎

یہ موج نفس کیا ہے، تلوار ہے خودی کیا ہے؟ تلوار کی دھار ہے
خودی کیا ہے، راز درون حیات خودی کیا ہے، بیداری کائنات
خودی جلوہ بدمست و خلوت پسند سمندر ہے اک بوند پانی میں بند
سبک اس کے ہاتھوں میں سنگ گراں پہاڑ اس کی ضربوں سے ریگ رواں
سفر اس کا انجام و آغاز ہے یہی اس کی تقویم کا راز ہے

خودی کے نگہباں کو ہے زہر ناب وہ ناں جس سے جاتی رہے اس کی آب
وہی ناں ہے اس کے لیے ارجمند رہے جس سے دنیا میں گردن بلند
خودی شیر مولا، جہاں اس کا صید زمیں اس کی صید، آسماں اس کا صید
ہر اک منتظر تیری یلغار کا تری شوخی فکر و کردار کا
یہ ہے مقصد گردش روزگار کہ تیری خودی تجھ پہ ہو آشکار

بال جبریل کا درج ذیل قطعہ بھی ملاحظہ ہو ؎

خودی کی جلوتوں میں مصطفائی خودی کی خلوتوں میں کبریائی
زمین و آسمان و کرسی و عرش خودی کی زد میں ہے ساری خدائی

"ضرب کلیم" میں ہے ؎

طلسم بود و عدم جس کا نام ہے آدم خدا کا راز ہے، قادر نہیں ہے جس پہ سخن
زمانہ صبح ازل سے رہا ہے محو سفر مگر یہ اس کی تگ و دو سے ہو سکا نہ کہن
اگر نہ ہو تجھے الجھن تو کھول کر کہہ دوں وجود حضرت انساں نہ روح ہے نہ بدن

"ارمغان حجاز" (اردو) میں ہے ؎

کہا تصویر نے تصویر گر سے نمائش ہے مری تیرے ہنر سے
و لیکن کس قدر نا منصفی ہے کہ تو پوشیدہ ہو میری نظر سے

مصور

تو ہے میرے کمالات ہنر سے نہ ہو نا امید اپنے نقش گر سے
مرے دیدار کی ہے اک یہی شرط کہ تو پنہاں نہ ہو اپنی نظر سے

اقبال نے مذکورہ بالا اشعار میں خودی بہ معنی خدا کا جو تصور پیش کیا ہے وہ در حقیقت ایک عجمی فکر ہے۔ اپنیشد کی تشریح کے مطابق انسان کے اندر جو روح پائی جاتی ہے وہ دو طرح کی ہے۔ ایک حقیقی روح یا حقیقی انا (Real self) جو جسمانیت سے آلودہ نہیں ہے یعنی غیر مادی ہے اور اسی کا نام آتما (Atman) ہے۔ دوسری روح غیر حقیقی ہے اور جسمانیت سے آلودہ (Embodiedself) ہے۔ اس کا نام جیو (Jiva) ہے۔ (۲۲)

جو حقیقی روح یعنی آتما ہے اسی کا نام حق (ست) ہے۔ یہ اصل وجود ہے۔ یہ صاحب شعور ہے لیکن کسی خاص چیز کا شعور نہیں رکھتا خواہ وہ چیز داخلی ہو یا خارجی ۔ یہ غیر آمیز شعور (Pure Consciousness) ہے۔ انسانی خودی اپنے مراتب وجود میں جس قدر ترقی کرتی جاتی ہے خالص ہوتی جاتی ہے یہاں تک کہ وہ خالص شعور کے درجہ تک پہنچ جاتی ہے اور اس وقت اس کا نام آنند (برہمن ذات مطلق) ہوتا ہے۔ (۲۳)

اپنیشد میں یہ بات متعدد مقامات پر کہی گئی ہے کہ آتما اور برہما ایک ہی ہیں، ان میں عینیت کا علاقہ ہے۔ ”وہ جو سورج میں ہے وہی آدمی میں ہے اور دونوں ایک ہیں یعنی برہمن (ذات مطلق)“۔ Chandogya Upanisad میں ہے کہ عالم تغیرات کی جو محض اشکال اور اسماء کا مجموعہ ہے، کوئی اصل نہیں۔ اصل حقیقت وہ ہے جو ان کے پس پردہ ہے، ازلی، نا قابل تغیر اور نا قابل تقسیم حقیقت جس کا نام برہمن یا ست ہے۔ اور اسی کا دوسرا نام انسانی خودی (self) یا آتما ہے۔ چنانچہ اس میں یہ فقرہ موجود ہے: Tat Tvam asi (That are thou)، یعنی روح عالم (برہمن ذات مطلق) اور آتما دونوں ایک ہیں۔ (۲۴)

یہ ٹھیک وہی بات ہے جو آگستائن (Augustine) کی تلاش حق میں ملتی ہے۔ وہ لکھتا ہے:

''میں نے زمین سے خدا کے بارے میں پوچھا، اس نے کہا، میں وہ نہیں ہوں۔ میں نے سمندر سے پوچھا، اس کی گہرائیوں اور اس میں رینگنے والی چیزوں سے پوچھا اور انہوں نے جواب دیا کہ ''ہم خدا نہیں ہیں، ہم سے اوپر جا کر تلاش کرو''۔ میں نے بادِ صبا اور ہوائی کائنات سے اور اس کے ساکنین، سورج، چاند اور ستاروں سے پوچھا۔ انہوں نے کہا ''جس خدا کے تم طالب ہو وہ ہم میں سے کوئی نہیں ہے''۔ میں نے ان تمام چیزوں سے بھی پوچھا جو میرے گوشت کے راستوں میں واقع ہیں (یعنی حواس)۔ تم کہتے ہو کہ وہ تم نہیں ہو، مجھے میرے خدا کے بارے میں ضرور کچھ بتاؤ۔ انہوں نے چیخ کر کہا ''وہ ہمارا خالق ہے''۔ جستجو جاری رہی یہاں تک کہ اپنے باطنی وجود (Inward self) سے سوال کیا، جواب ملا، ''تمہارا خدا خود تمہارے اندر ہے، تمہاری زندگی کی زندگی (The life of the life)''۔ (۲۵)

انسانی روح (نفس، خودی) کا ربانی تصور یعنی یہ کہ خدا اور روح (انا) میں کوئی جوہری فرق نہیں ہے، اسلامی نقطۂ نظر سے سراسر کفر و شرک ہے۔ قرآن مجید کی ایک سے زیادہ آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانی انا کائنات کی دوسری چھوٹی بڑی اناؤں کی طرح مجعول و مخلوق ہے، فرق صرف اس قدر ہے کہ انسانی نفس ایک ایسی صفت رکھتا ہے جس سے دوسرے نفوس محروم ہیں، اور وہ تجلی علم ہے۔ اسی صفت کی وجہ سے وہ کائنات کی دوسری مخلوقات پر برتری رکھتا ہے اور اسی جوہر کے باعث مسجود ملائک ٹھہرا۔ اس تجلی علم کو قرآن مجید میں ''نفخ روح'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ارشاد ہے:

ثُمَّ سَوّٰهُ وَ نَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ وَ جَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَ الْاَبْصَارَ وَ الْاَفْئِدَةَ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ (سورۂ سجدہ:۹)	پھر اس نے اس کا تسویہ کیا (یعنی نک سک سے درست کیا) اور اس میں اپنی روح میں سے پھونکا اور تمہارے لیے کان، آنکھیں اور دل بنائے (تا کہ تم ان کے ذریعہ علم حاصل کرو)، تم بہت کم شکر کرتے ہو۔

رہی یہ بات کہ نفس انسانی کی حقیقت کیا ہے اور اس نفس اور خدا میں کس نوع کا تعلق ہے اس کا ادراک انسان کی محدود عقل سے ممکن نہیں ہے، ہر دور کے صوفیہ اور فلاسفہ نے اس باب میں جو روحانی اور عقلی کاوشیں کی ہیں وہ اندھیرے میں تیر چلانے کے مترادف ہے۔ اس سلسلے میں اسلام کی

تعلیم بڑی حکیمانہ ہے اور وہ یہ ہے کہ نفس کی حقیقت معلوم کرنے کے بجائے اچھے اعمال کے ذریعہ اس کا تزکیہ کیا جائے تا کہ اس کے روحانی اور علمی کمالات ظاہر ہوں اور دنیا اور آخرت دونوں میں کامیابی حاصل ہو۔

اگر اقبال خودی کے اس تصور پر قائم رہتے جو انہوں نے ''اسرار خودی'' میں پیش کیا ہے یعنی خودی بہ معنی نفسی قوت تو یہ ایک مثبت اور تعمیری خدمت ہوتی اور مسلم قوم کے خفتہ عزائم کو مہمیز کرنے کا ذریعہ بنتی۔ لیکن اس صورت میں شاعری کی آب و تاب کو قائم رکھنا مشکل ہوتا جیسا کہ اسرار خودی سے واضح ہے۔ اس میں شاعری کم اور وعظ زیادہ ہے۔ اس کے برخلاف ''پیام مشرق'' اور ''زبور عجم'' میں جو شاعرانہ حسن و زیبائی ہے وہ بڑی حد تک وحدت الوجود کی مرہون منت ہے۔

۳۔ اس سے پہلے خودی کے جن دو مفہومات کا ذکر کیا گیا ان کے علاوہ اس کا ایک تیسرا مفہوم بھی ہے اور وہ خودی بہ معنی غیرت و خودداری اور اولوالعزمی ہے۔ آقائی اور غلامی میں بس اتنا ہی فرق ہے کہ غلام خواہ کوئی فرد ہو یا قوم، خودی کے جوہر بے بہا سے تہی دامن ہوتا ہے۔ اگر کسی قوم میں غیرت و خودداری کا جذبہ موجود نہیں ہے تو اس کی قومی نشاۃ ثانیہ ممکن نہیں ہے۔ چونکہ اقبال کا تعلق ایک محکوم ملک سے تھا اس لیے انہوں نے ہر ممکن کوشش کی ہے کہ اپنی محکوم قوم کی خودی کو بیدار کریں یعنی اسے ایک غیرت مند اور خوددار قوم بننے کی تلقین کریں کہ اسی جوہر سے آراستہ ہو کر وہ ذلت و محکومی سے نجات حاصل کر سکتی تھی۔ درج ذیل اشعار میں خودی بہ معنی غیرت و خودداری کا ذکر ہوا ہے ؎

کسے نہیں ہے تمنائے سروری لیکن　　خودی کی موت ہو جس میں وہ سروری کیا ہے

(بال جبریل)

خودی ہو زندہ تو ہے فقر بھی شہنشاہی　　نہیں ہے سنجر و طغرل سے کم شکوہ فقیر

خودی ہو زندہ تو دریائے بیکراں پایاب　　خودی ہو زندہ تو کہسار پرنیاں و حریر

نہنگ زندہ ہے اپنے محیط میں آزاد　　نہنگ مردہ کو موج سراب بھی زنجیر

خودی کی موت سے ہندی شکستہ بال و پر　　قفس ہوا ہے حلال اور آشیانہ حرام

خودی کی موت سے پیر حرم ہوا مجبور　　کہ بیچ کھائے مسلماں کا جامۂ احرام

(ضرب کلیم)

ترے بلند مناصب کی خیر ہو یا رب
کہ ان کے واسطے تو نے کیا خودی کو ہلاک (ضرب کلیم)

اقبال کی نظر میں غیرت وخودداری اور اولوالعزمی جیسی صفات کو نہایت بلند مقام حاصل تھا۔ پرندوں میں وہ شاہین کو اسی لیے پسند کرتے تھے کہ اس پرندے میں یہ اوصاف موجود ہیں۔ ''بال جبریل'' کی نظم ''شاہین'' ملاحظہ ہو ؎

کیا میں نے اس خاکداں سے کنارا — جہاں رزق کا نام ہے آب و دانہ
بیاباں کی خلوت خوش آتی ہے مجھ کو — ازل سے ہے فطرت مری راہبانہ
نہ باد بہاری ، نہ گلچیں ، نہ بلبل — نہ بیماری نغمۂ عاشقانہ
خیابانیوں سے ہے پرہیز لازم — ادائیں ہیں ان کی بہت دلبرانہ
ہوائے بیاباں سے ہوتی ہے کاری — جواں مرد کی ضربت غازیانہ
حمام و کبوتر کا بھوکا نہیں میں — کہ ہے باز کی زندگی زاہدانہ
جھپٹنا ، پلٹنا ، پلٹ کر جھپٹنا — لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ
یہ پورب ، یہ پچھّم ، چکوروں کی دنیا — مرا نیلگوں آسماں بے کرانہ
پرندوں کی دنیا کا درویش ہوں میں — کہ شاہیں بناتا نہیں آشیانہ

بال جبریل ہی میں ''چیونٹی اور عقاب'' کے عنوان سے ایک مختصر لیکن بڑی معنی خیز نظم ہے۔ چیونٹی عقاب سے پوچھتی ہے ؎

میں پائمال وخوار و پریشان و دردمند — تیرا مقام کیوں ہے ستاروں سے بھی بلند

عقاب اس سوال کے جواب میں کہتا ہے ؎

تو رزق اپنا ڈھونڈتی ہے خاک راہ میں — میں نُہ سپہر کو نہیں لاتا نگاہ میں

اقبال کی نظم ''شاہین'' پر کئی اہل علم وادب نے اعتراض کیا ہے کہ یہ تو سفاکی اور خوں خواری کو سند جواز عطا کرنا ہے۔ ان ناقدوں میں مجنوں گورکھپوری نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''جس طرح اقبال کے تصور میں حجاز نے اپنا تسلط جمالیا تھا، اسی طرح عقاب، شاہین، شہباز اور چیتے جیسے سفاک جانوروں نے بھی ان کی فکر وبصیرت میں

ایک مرکزی حیثیت اختیار کرلی تھی اور وہ انسان میں بھی بالخصوص ''مردمومن'' میں انہی پھاڑ کھانے والے جانوروں کی خصلت دیکھنا چاہتے ہیں، سنیے کتنی لذت لے کر کہتے ہیں ۔

جو کبوتر پر جھپٹنے میں مزا ہے اے پسر   وہ مزا شاید کبوتر کے لہو میں بھی نہیں

ذرا ہم اور آپ تھوڑی دیر کے لیے سوچیں کہ یہ غارت گرانہ میلان عام ہوجائے اور زبردستوں کو زیردستوں پر یوں ہی جھپٹنے کا معاشرتی اور قانونی حق دے دیا جائے تو ہماری دنیا کا کیا حال ہوگا؟ اور وہ رہنے کے لیے کیسی جگہ ہوگی؟''۔(۲۶)

اقبال نے ان ناقدوں کو جو جواب دیا، وہ ملاحظہ ہو:

''شاہین کی تشبیہ محض شاعرانہ تشبیہ نہیں ہے۔اس جانور میں اسلامی فقر کی تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں: ا۔خوددار اور غیرت مند ہے کہ کسی اور کے ہاتھ کا مارا ہوا شکار نہیں کھاتا، ۲۔بے تعلق ہے کہ آشیانہ نہیں بناتا، بلند پرواز ہے، ۳۔خلوت پسند ہے، ۵۔تیز نگاہ ہے''۔(۲۷)

''ضرب کلیم'' میں ''محراب گل افغان کے افکار'' کے عنوان سے اقبال نے جو اشعار کہے ہیں ان میں باعتبار ترتیب جو ساتویں نظم ہے اس میں عرفان خودی کی دعوت ایک نئے مگر دلکش اسلوب میں دی گئی ہے۔اس دعوت کا مرکزی خیال جہد وعمل اور خودداری ہے۔ملاحظہ ہو یہ نظم ۔

رومی بدلے ، شامی بدلے ، بدلا ہندوستان
تو بھی اے فرزند کہستاں ! اپنی خودی پہچان
اپنی خودی پہچان
او غافل افغان

موسم ، اچھا ، پانی وافر ، مٹی بھی زرخیز
جس نے اپنا کھیت نہ سینچا وہ کیسا دہقان
اپنی خودی پہچان
او غافل افغان

اونچی جس کی لہر نہیں ہے وہ کیسا دریا ہے
جس کی ہوائیں تند نہیں ہیں وہ کیسا طوفان

اپنی خودی پہچان
او غافل افغان

ڈھونڈ کے اپنی خاک میں جس نے پایا اپنا آپ
اس بندے کی دہقانی پر سلطانی قربان

اپنی خودی پہچان
او غافل افغان

تیری بے علمی نے رکھ لی بے علموں کی لاج
عالم فاضل بیچ رہے ہیں اپنا دین ایمان

اپنی خودی پہچان
او غافل افغان

خلاصۂ بحث: ہم نے گزشتہ صفحات میں اقبال کے تصور خودی کی جو تفصیل پیش کی ہے اس سے ان کا یہ الجھا ہوا فلسفہ بڑی حد تک قابل فہم ہو گیا ہے اور اس سلسلے میں بہت سے اہل علم نے جو فکری ژولیدگی پیدا کردی ہے اس کا اطمینان بخش ازالہ ہو گیا۔ اب ہم اعتماد کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اقبال نے ابتدا یعنی ''اسرار خودی'' میں خودی کا جو تصور دیا یعنی نفسی قوت اور اس کا استحکام، وہ درحقیقت عجمی تصوف سے ان کی بغاوت کا اعلان ہے جس نے مسلمانوں کو راہبانہ اخلاق کی تعلیم دی اور ترک دنیا کی تلقین نے ان کی قوت عمل کو بالکل خراب وخستہ کردیا تھا۔

لیکن افسوس کہ اقبال اپنے اس تصور خودی پر زیادہ دیر تک قائم نہ رہے۔ انہوں نے بہت جلد مولانا روم کی پیروی میں اور اس کا ذکر تفصیل سے ہو چکا ہے، خودی بہ معنی خدا کے عجمی تصور کو قبول کرلیا۔ مولانا روم فرماتے ہیں ؎

دو مبیں و دو مخواں و دو مداں خواجۂ ما خواجۂ خود را بخواں
چوں جدا بینی زحق ایں خواجہ را گم کنی ہم متن و ہم دیباچہ را

”دونہ دیکھو اور دونہ کہو اور دونہ جانو۔ ہمارے خواجہ کو اپنے خواجہ میں شامل سمجھو۔ اگر اس خواجہ کو حق (خدا) سے جدا دیکھے گا تو متن اور دیباچہ دونوں کو گم کردے گا“۔

مولانا روم کی اس وحدت الوجودی فکر کو اقبال نے اپنے تصور خودی کی اساس قرار دیا اور ”اسرار خودی“ کے بعد کی جملہ شعری تصانیف میں جیسا کہ پہلے بیان کیا جاچکا ہے، زیادہ تر اسی فکر کو مختلف اسالیب میں پیش کیا ہے۔ خودی کا یہ عجمی مفہوم قرآن مجید کے تصور توحید سے صریحاً متصادم ہے، اس سے بوئے کفر وشرک آتی ہے۔ البتہ خودی کے دوسرے دو مفہومات یعنی نفسی قوت اور خودداری، مثبت اور لائق تحسین ہیں۔

مآخذ وحواشی

(۱۷) تلاش اقبال، ص ۳۵۔ (۱۸) صوفیہ نے قرآنی اصطلاحات سے جس طرح صرف نظر کیا ہے یہ اس کی ایک مثال ہے۔ قرآن کی اصطلاح میں اس قلبی اطاعت کا نام تقویٰ ہے۔ (۱۹) قرآن مجید میں اس حسن اطاعت کو احسان کہا گیا ہے۔ (۲۰) اقبال نامہ، حصہ اول، ص ۲۰۲، ۲۰۳۔ مکتوب مورخہ ۱۲؍ دسمبر ۱۹۳۶ء)۔ (۲۱) اسرار خودی، منظوم ترجمہ: عبدالرشید فاضل وکوکب شادانی، اقبال اکیڈمی لاہور پاکستان، ۱۹۷۶ء، ص ۵۔ (۲۲) The Encyclopaedia of Religion, New York / London, 1987, Vol.15, P.20۔ (۲۳) ایضاً۔ (۲۴) The New Encyclopaedia Britannica Macropaedia (Reference and Index) 1974, Vol.X, P.283, and The Encyclopaedia of Religion, Vol.15, P.208۔ (۲۵) Confessions X, chap.6, with ref. to Indian philosophy, Dr. Radha Krishnan, London, 1948, Vol.1, P.146۔ (۲۶) اقبال، مجنوں گورکھپوری، بحوالہ اقبال کامل، ص ۲۱۳۔ (۲۷) اقبال نامہ، حصہ اول، ص ۲۰۴، ۲۰۵۔

ریاست بہاول پور کے عمائد کی فارسی ادبی خدمات

ڈاکٹر عصمت درانی

علم وادب کا ذوق خانوادہ عباسیہ کا مایہ ناز ورثہ رہا ہے اور اس موروثی روایت کو امرائے ریاست بہاول پور نے بھی قائم رکھا اور تقریباً ہر نواب نے علم کی سرپرستی اور ادبا شعرا کی قدردانی کی ہے۔خود بھی کئی نواب، صاحب قلم، انشا پرداز اور شاعر ہوئے ہیں۔ ذیل میں ان نواب صاحبان کی علمی وادبی سرگرمیوں کا ایک مختصر جائزہ پیش کیا جاتا ہے:

عباسیوں کے بزرگوں میں پہلے مصنف داؤد خان عباسی ہیں جنھوں نے بارہویں صدی ہجری میں فارسی میں شکار اور جانوروں کے علاج معالجہ کے متعلق تیس ابواب پر مشتمل کتاب صید المراد فی قوانین الصیاد تصنیف کی اور یہ نادر کتاب کرنل ڈی سی فلٹ نے ۱۹۰۸ء میں رائل ایشیاٹک سوسائٹی، کلکتہ کے زیر اہتمام شائع کی۔ (کتاب شناسی آثار فارسی چاپ شدہ درشبہ قارہ، ج ۲، ص ۱۱۱۴) اس کتاب کے علاوہ داؤد خان عباسی کی طب پر ایک نادر تصنیف طب داؤدی کے نام سے بھی ہے، جس کے کئی قلمی نسخے مختلف کتب خانوں میں موجود ہیں۔ (فہرست مشترک نسخہ ہای خطی فارسی پاکستان، جلد اول، ص: ۶۲۶ ۔ ۱۹۸۳ء) میاں داؤد خان کے بھائی میاں نور محمد خدا یار خان عباسی، والی سندھ، کی بھی ایک کتاب منشور الوصیت و دستور الحکومت دستیاب ہے جو ۱۱۶۳ھ/ ۱۷۵۰ء میں لکھی گئی۔ یہ کتاب حسام الدین راشدی (۱۹۱۱۔ ۱۹۸۲ء) کے اہتمام اور مقدمہ کے ساتھ سندھی ادبی بورڈ سے ۱۹۶۴ء میں شائع ہوئی۔ جس سے ان کے ادبی ذوق کا پتا چلتا ہے اور ان کے ذاتی اخلاق اور حکومت سے متعلق ان کے تصورات پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ میاں نور محمد عباسی نے اس

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ فارسی، اسلامیہ یونیورسٹی، بہاول پور۔

تصنیف میں اپنی ان نادر کتب کا بھی ذکر کیا ہے جو نادر شاہ ان کے سیم وزر کے ساتھ سمیٹ کر لے گیا تھا۔شعروادب اور تصنیف و تالیف کا سلسلہ امیر داؤد خان کے بعد ان کی اولاد میں جاری نہ رہ سکا۔اس کی وجہ یہ تھی کہ امیر داؤد خان کے بعد ان کی اولاد شکار پور سے بہاول پور آ گئی اور یہاں اپنی ریاست قائم کرنے کے جاں گسل مرحلوں سے گذرتے ہوئے ان کا ابتدائی دور باہمی اور قبائلی عصبیتوں کے علاوہ سکھوں، راجپوتوں اور بلوچوں سے لڑائی جھگڑوں میں گذرا۔ان حالات میں ادبی سرگرمیوں کا جاری رہنا نہ صرف مشکل بلکہ ناممکن تھا۔ابتدائی امیران کا دور ریاست کے قیام کی جدوجہد اور استحکام کی نذر رہا۔تاہم اتنا پتا چلتا ہے کہ نوابان بہاول پور نے جگہ جگہ مدرسے اور مکتب قائم کیے۔حتیٰ کہ ڈیرا اور جیسا ریگستانی علاقہ بھی مکتب سے محروم نہ رہا۔(قصہ شہزادہ اسحاق، مقدمہ مرتب، ص:۸)

نواب محمد بہاول خان ثانی (۱۷۷۲ء۔۱۸۰۹ء) پہلے حکمراں تھے جن کے دربار سے متعدد علمی شخصیات وابستہ ہوئیں۔ان کے دربار سے کئی فارسی خطوط تیمور شاہ درانی (۱۷۷۳ء۔۱۷۹۳ء) والی کابل کو لکھے گئے۔مذکورہ نواب کے دور میں ریاست بہاول پور کی تاریخ کے بارے میں پہلی کتاب مرآت دولت عباسی لالہ دولت رائے ولد لالہ عزت رائے نے لکھی۔اسی نواب کے دور میں ۱۷۷۹ء میں مولوی حفیظ الاسلام اور مولوی عین الدین مع اپنے دو بیٹوں مولوی امام الدین اور مولوی غلام الدین بہاول پور تشریف لائے جن کی علمی و مذہبی کاوشوں کی بدولت امیران بہاول پور نے ریاست کا منصب قضا اسی خاندان کو تفویض کر دیا۔یہ منصب ریاست کے پاکستان سے الحاق تک اسی خاندان کے پاس رہا۔اسی دور میں تاریخ عاصم کوفی کا فارسی ترجمہ مولوی محمد مستوفی بن احمد مستوفی نے کیا جو ملازم سرکار تھے اور بہت عالم وفاضل شخص تھے۔اس عہد میں بھی ترجمہ، تالیف اور جلد سازی کا خاص اہتمام ہوتا تھا۔جلد کے گتے خاص طور پر تیار کیے جاتے تھے اور ان پر زیب وزینت کے لیے جو مہریں اور نقوش ثبت کیے جاتے تھے ان پر بھی نواب کا نام کندہ ہوتا تھا۔اسی ترجمہ تاریخ عاصم کوفی کا ایک قلمی نسخہ (رجسٹر نمبر: ۲۳۲) کتب خانہ سلطانی میں موجود تھا (فہرست کتب لائبریری دولت خانہ عالیہ، ص:۳۸) اس کے کاتب، جس کا نام شجاع تھا، نے کتابت ختم کر کے یہ قطعہ لکھا:

شد این کتاب دل آویز و نسخہ دلخواہ	بحسن خاتمت آراستہ بحمد اللہ
بحکم نافذ و فرمائش امیر و کبیر	کہ صیت معدلتش کردہ شیر را روباہ
سحاب بخشش و ینبوع فیض و بحر کرم	کہ کوہ پیش نوابش بود کم از پرکاہ
خجستہ طالع و فیروز بخت و نصرت جنگ	نواب حافظ ملک و عماد دولت و جاہ
مدار دایرہ مرحمت بہاول خان	علیٰ مفارقنا اللہ دائماً ابقاہ
ہمیشہ بدرقۂ حفظ حافظ مطلق	ز بہر دفع بلیات باشدش ہمراہ
برای مصلحت خلق خود نگہ دارد	خدا زچشم بدش ہر زمان بجز زو پناہ
بکسب خیر و رعیت نوازی و انصاف	بجملہ باد موافق بسال و ہفتہ و ماہ
شجاع کاتب این نسخہ گو یداز دل وجان	دعاے دولت و اقبال او گہ و بیگاہ

(العزیز، اپریل ومئی، ۱۹۴۵ء، ص:۵۔۶)

صادق محمد خان ثانی (۱۸۰۹۔۱۸۲۵ء) نے بھی اپنے دور میں علمی سرپرستی جاری رکھی۔ مسند نشین ہونے کے بعد اراکین ریاست کا تقرر کیا تو انہوں نے بطور تاریخ نویس مولوی محمد اعظم (۱۷۶۹۔۱۸۶۷ء) کو مقرر کیا۔ جنہوں نے ۱۸۳۸ء میں فارسی زبان میں بہاول پور کی تاریخ تذکرۃ الخوانین المعروف جواہر عباسیہ تحریر کی۔

نواب بہاول خان ثالث (۱۸۲۵۔۱۸۵۲ء) کا دور علمی سرپرستی کے لحاظ سے بہت اہمیت کا حامل ہے کیونکہ وہ خود اعلیٰ تعلیم یافتہ انسان تھے جس کا اندازہ اس عہد کی مشہور تاریخ جواہر عباسیہ پر ان کے طرز تحریر اور حواشی سے لگایا جا سکتا ہے جو اس کتاب کے اصل نسخے پر اپنے ہاتھ سے تحریر کیے۔ اس وقت قلعہ ڈیراور کو امیران بہاول پور کے دارالحکومت کی حیثیت حاصل تھی۔ یہاں ریاست کا دارالانشاء قائم کیا گیا تھا جہاں اس دور کے نامور عالم، منشی اور کاتب موجود رہتے تھے۔ ریاست بہاول پور کی قلمی تاریخ جواہر عباسیہ بھی قلعہ ڈیراور کے برج ککوہا میں لکھی گئی جہاں تالیف اور ترجمہ کا باقاعدہ شعبہ قائم تھا۔ حتیٰ کہ کاغذ کی تیاری اور جلد بندی کا بھی معقول انتظام تھا۔ نواب بہاول خان ثالث اپنے اعلیٰ درباری عہدے داران کو نصیحت آموز خط لکھتے تھے، خصوصاً اپنے وزیر محمد یعقوب خان کو ترک دنیا اور ہمہ وقت وظائف اور حبس دم میں مصروف رہنے اور فرائض

منصبی کی انجام دہی میں غفلت برتنے میں فارسی زبان میں خطوط لکھے، جن کا نمونہ تاریخ الوزرا میں (ص ۱۰-۱۱) دیکھا جاسکتا ہے۔

نواب فتح خان عباسی (۱۸۵۸-۱۸۵۳ء) کا دور اگرچہ بہت مختصر تھا لیکن اس نواب نے بھی علماء کی سرپرستی میں کوئی کمی نہ چھوڑی۔ انہوں نے اپنے ولی عہد کی باقاعدہ تعلیم وتربیت کے لیے مولوی ظہورالدین کو بطور اتالیق مقرر کیا۔ اسی نواب کے دور میں پنجاب سے تعلق رکھنے والے فقیر شاہنوازالدین اور فقیر سراج الدین بہاول پور میں آئے اور بہاول پور میں اردو ادب کی اشاعت کا سنگ بنیاد رکھا۔

نواب بہاول خان رابع (۱۸۵۸-۱۸۶۶ء) کے دور میں سید مراد شاہ (۱۸۶۵-۱۸۷۶ء) جو ریاست میں نیٹو ایجنٹ، ناظم اور صدر منصف کے عہدوں پر فائز رہے۔ ان کا تعلق ملتان کے گردیزی خاندان سے تھا۔ انہوں نے اردو زبان میں پانچ جلدوں پر مشتمل تاریخ مراد تحریر کی جسے بہاول پور کی تاریخ پر اردو زبان کے سب سے پہلے ماخذ ہونے کا شرف حاصل ہے۔

نواب صادق خان رابع (۱۸۶۶-۱۸۹۹ء) کے ابتدائی دور کے ایک عالم مولانا عزیزالدین کا ذکر بھی کافی اہمیت کا حامل ہے جو دولت خانہ بہاول پور اور شاہی مسجد کے خطیب تھے۔ ان کا تعلق گوجرانوالہ سے تھا جو ریاست کے امیران کی علم دوستی کا چرچا سن کر دربار بہاول پور سے منسلک ہوئے۔

نواب بہاول خان خامس (۱۸۸۳-۱۹۰۷ء) صاحب تصانیف ہیں۔ ان کی چار اردو تصانیف کا سراغ ملتا ہے۔ ان میں سے ایک قصہ شہزادہ اسحاق ہے جس میں آتش پرستی کے خلاف اور اسلام کے حق میں نہایت مدلل بحث اور مناظرہ نقشہ دکھایا ہے۔ یہ قصہ بہاول پور کے صادق الانوار پریس میں جنوری ۱۹۰۲ء میں طبع ہوا۔ عزیز الرحمان عزیز (۱۸۷۳-۱۹۴۴ء) نے نواب صاحب کے حکم سے اسی قصے کو مثنوی نورونار کے نام سے منظوم کیا۔ اسی سال آپ نے گلزار شجاعت لکھی جس کے تین حصے مشہور الزمان نامہ، نورالزمان نامہ اور فیروز نامہ کے عنوانات کے تحت علاحدہ علاحدہ شائع ہوئے۔ نواب صاحب نے طلسم ہوش ربا اور داستان امیر حمزہ کی طرز پر ایک بہت لمبی داستان لکھنا شروع کی تھی لیکن وہ نہ مکمل ہوئی نہ شائع ہوسکی۔ انہوں نے مولوی غلام احمد اختر

کو تاریخ بہاول پور لکھنے پر مامور کیا۔نواب بہاول ادبی تقریبات میں بھی شرکت سے گریز نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ ۲۹/دسمبر ۱۹۰۳ء کو انہوں نے انجمن موید الاسلام کے جلسے میں شرکت کی جو سرائے گودھومل میں ہوا تھا۔نواب صاحب نے اس میں شرکت بھی کی اور ایسی انجمنوں سے اپنی دلچسپی کا اظہار بھی کیا۔ان کی مسند نشینی پر علامہ محمد اقبال نے قصیدہ لکھ کر بھیجا۔(باقیات اقبال،ص: ۱۸۵۔۱۸۶) نواب بہاول خان کا یہ علمی ذوق ان کی ریاست کے عہدے داروں کے لیے بھی تحریک عمل کی حیثیت رکھتا تھا۔ان کے عہد میں مولوی محمد دین، شیخ محمد نصیر الدین،شہزادہ محمد اشرف گورگانی، میر سراج الدین اور مولوی عبدالمالک صادقی اور غلام احمد اختر اور کئی دیگر افراد نے تصنیف وتالیف میں حصہ لیا اور ان کے قلم سے کئی کتابیں تصنیف ہوئیں۔

نواب صادق خان خامس (۱۹۰۴۔۱۹۶۶ء) عمدہ علمی وادبی ذوق رکھتے تھے۔انہوں نے ۱۹۳۵ء میں سیرت رسولؐ پر ایک کتاب رسول صادق نام سے تصنیف کی، جو مرکز اشاعت سیرت جالندھر سے شائع ہوئی۔آپ نے اپنے محلات میں کتب خانے قائم کیے جہاں ایک محتاط اندازے کے مطابق چھتیس ہزار کے قریب نایاب کتب اور نادر مخطوطات جمع تھے۔نواب صادق خان خامس کے دور میں ریاست بہاول پور کی دو تاریخیں صادق التواریخ اور صبح صادق لکھی گئیں۔ نواب صادق خان خامس کے دور میں سر عبدالقادر جیسی علمی وادبی شخصیت کو چیف جسٹس مقرر کیا گیا اور ان کی زیر سرپرستی ۲۹/اپریل ۱۹۴۳ء میں، بہاول پور میں کل ہند مشاعرے کا انعقاد ہوا۔ اس ریاست کے آخری درباری شاعر حفیظ جالندھری تھے جو نواب صادق محمد خامس کے دور تک بہاول پور آتے تھے اور ان کی مدح میں قصائد کہا کرتے تھے(بہاول پور میں اردو،ص ۵)

اگر چہ اردو کو انیسویں صدی عیسوی کے وسط میں سرکاری سرپرستی حاصل ہو گئی تھی اور اہل علم نے اس میں دلچسپی لینی بھی شروع کر دی تھی لیکن فارسی زبان سے صدیوں کی وابستگی ایسی نہ تھی کہ اسے یک لخت ختم کیا جا سکتا۔ دینی وروحانی علوم کا سرمایہ بھی فارسی کتب ہی میں محفوظ تھا،اس لیے صاحب قلم حضرات نے بھی اپنی تخلیقات کے لیے فارسی زبان ہی کو ترجیح دی۔ ریاست کے ڈھائی سوسالہ دور میں جہاں والیان ریاست نے علم وادب کی ترقی میں خصوصی دلچسپی لی ہے، وہاں کئی ریاستی وزرا اور عمائد ریاست کے علاوہ عام ملازمین بھی علم وادب کے دلدادہ رہے ہیں۔ روحانی

بزرگوں کے دوش بدوش تصنیف وتالیف میں جن اہل علم حضرات نے حصہ لیا ان میں سے بیشتر وہ ہیں جو ریاست کے عمائدین اور ملازمین تھے۔ان میں سے کچھ حضرات شاعر بھی تھے۔یہاں ان کا مختصراً ذکر کیا جاتا ہے:

مولوی محمد صالح: مولوی محمد صالح، بہاول خان ثانی کے اتالیق تھے اور نواب بہاول خان ثانی کے دربار میں شاہی مؤرخ تھے۔مہاراجہ رنجیت سنگھ (وفات:۱۸۳۹ء) کے دربار میں کئی بار نواب کے سفیر کی حیثیت سے حاضر ہوئے۔طب میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ان کا شجرۂ نسب تیس واسطوں سے حضرت عبداللہ بن عباس تک جا پہنچتا ہے۔مولوی محمد صالح اپنے عہد کے ممتاز شاعر اور ادیب تھے۔انہوں نے کئی قصائد اور نظمیں تخلیق کیں۔اشعار بطور نمونہ:

امیری خرد مند والا نعم "کریم السجایا جمیل الشیم"
جہاندار جم جاہ دار شکوہ خداوند اکبر سکندر پژوہ
بہ شہر مروت زہی شہر یار بہ ملک فتوت شہ نامدار
بہ جود و کرم ہم بہ عدل شہان گذشت از جہانگیر و شاہ جہان
بہ آمال و آمانی اہل رنج گشادہ بہ دست کرم باب گنج

(جواہر عباسیہ، خطی، ص:۱۲،۱۱)

لالہ دولت رائے: سال ولادت ووفات کے بارے میں معلومات نہیں ملتیں۔اتنا پتا چلتا ہے کہ لالہ دولت رائے ولد لالہ عزت رائے نواب بہاول خان ثانی کے ملازمین میں شامل تھے۔علم وادب سے خاص دلچسپی تھی اور فارسی کے اچھے انشا پرداز تھے۔مصنف اور ان کے والد دونوں دربار بہاول پور سے وابستہ تھے اور اپنی علمی لیاقت کی وجہ سے بطور وکیل وسفیر بیرونی ریاستوں میں بھیجے جاتے تھے۔نواب بہاول خان ثانی کے عہد میں لالہ دولت رائے نے بہاول پور کی پہلی تاریخ مرات دولت عباسی کے نام سے فارسی میں لکھی جو دو حصوں پر مشتمل ہے اور بہاول پور کی تاریخ کے اولین ماخذوں میں شمار ہوتی ہے اور اس میں خلافت عباسیہ کی مختلف زمانوں کی مسلسل تاریخ اور والیان ریاست بہاول پور کے حالات نواب بہاول خان کے عہد تک قلم بند کیے گئے ہیں۔اس کا پہلا حصہ ۱۲۲۴ھ میں اور دوسرا حصہ ۱۲۲۷ھ میں مکمل ہوا۔مرات دولت عباسی کے خطی نسخوں کی

تفصیل درج ذیل ہے:

۱۔رائل ایشیا ٹک سوسائٹی،لندن،فہرست،ص ۹۰،نمبر[Morley,88]

۲۔خدابخش لائبریری،پٹنہ،[Suppt.i.1774] تاریخ کتابت ۱۲۶۲ھ/۱۸۴۶ء

۳۔برٹش میوزیم لائبریری، [Rieu, vol.3, pt.1, p650]تاریخ کتابت درج نہیں۔ ۱۳ھ/۱۹ویں عیسوی سے متعلق ہے۔[Storey, vol. 1, pt.1, p 650]

۴۔خط شکستہ میں کتابت شدہ ایک نسخہ،جس کا اصل نسخہ معلوم نہیں کہاں ہے لیکن اس کا عکس راقم الحروف کے پاس موجود ہے۔اس کا ترقیمہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

"تمت تمام شد این کتاب قسم ثانی از کتاب مرات دولت عباسی از منقوله (منقوله از) نسخه دستخطی لاله رام کشن سدانه ولد لاله لچھمی نرائن سدانه، به دستخط فقیر پر تقصیر عاصی معاصی عبودیت گزین بنده بھوپت رای ولد لاله صاحب فیض بخش فیض رسان لاله بخش لاله جیو بن لاله صاحب ولی نعمی سدا رنگانی صاحب اودیے جیو ساکن شهر ملتان به محله جرمان قریب دروازه سری جیو اندرون دروازه دهلی شهر ملتان بروز دو شنبه به تاریخ سیز دهم ماه کاتک ۱۸۰۹/۱۹۱۸ بکرمی"(ص: ۳۳۳)۔

۵۔کتب خانہ سلطانی۔حصہ اول (رجسٹر نمبر: ۷۷۱) حصہ دوم (رجسٹر نمبر: ۷۷۲) (فہرست کتب لائبریری دولت خانہ عالیہ،ص:۴۰)

شاہی کتب خانے کی فہرست کے مندرجات سے ظاہر ہے کہ یہ نسخہ کتب خانہ سلطانی میں موجود تھا لیکن نواب صادق خامس کی وفات اور کتب خانہ کی ورثا میں تقسیم کے بعد اب اس کے متعلق کچھ علم نہیں ہے۔

۶۔محمد نظام الدین نظامی،فاضل عربی وفارسی،معلم رفیق العلماء مڈل اسکول،صادق آباد، ضلع رحیم یارخان کا مرات دولت عباسی کے پہلے حصے کا کتابت شدہ ایک نسخہ جو ۲۰/جولائی ۱۹۷۴ء کو مکمل ہوا۔اس نسخے کا عکس میرے پاس موجود ہے۔

یہ کتاب ۱۸۵۰ء میں مطبع اردو اخبار، دہلی سے ۶۷ ۴ صفحات میں طبع ہوئی۔ محمد نظام الدین نظامی نے مرات دولت عباسی کا اردو ترجمہ آئینہ عباس سلطانی کے نام سے کیا اور نواب محمد عباس خان عباسی کو پیش کیا۔ (آئینۂ عباس سلطانی، خطی، ص:۲۲۱)

دولت رائے کی دوسری تصنیف چار چمن (۱۲۲۵ھ) ہے۔ یہ ہندوستان کی عمومی تاریخ ہے۔ اس میں چار چمن اور سات بہاریں ہیں۔ پہلے تین چمنوں میں دہلی کا ذکر، ہندوؤں کے میلوں کے حالات، ان کے مقدس مقامات کا تذکرہ، راگوں اور راگنیوں پر تبصرہ، اور شاعروں اور نثر نگاروں کی زندگی کے حالات ہیں۔ اولیا کے سوانح بھی ہیں اور امرائے مغلیہ کی فہرست بھی دی گئی ہے۔ چوتھے چمن میں شاہان ایران اور سلطنت انگلیسیہ ہند کا بیان ہے۔ اس کا ایک نسخہ پنجاب پبلک لائبریری، لاہور میں محفوظ ہے۔ (ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ، ص۲۰۰)

چوکس رائے (وفات: ۱۸۵۳ء): چوکس رائے ریاست بہاول پور میں پروانہ نویس تھا۔ اس کی قابلیت کے متعلق ایک واقعہ مشہور ہے کہ ۱۸۳۸ء میں جب شاہ شجاع الملک اور ولیم میگناٹن صاحب بہادر، انگریزی فوج کے ساتھ بہاول پور آئے اور بہاول خان ثالث ان سے ملاقات کے لیے گئے تو شاہ شجاع نے نواب صاحب کو شاہنامہ کے مطالعہ کی ترغیب دلا کر کہا:

ہر آنکس کہ شاہنامہ خوانی کند
اگر زن بود پہلوانی کند

منشی چوکس رائے نے برجستہ فوراً عرض کیا۔ حضور!

ہر آنکس کہ خود پہلوانی کند
چہ حاجت کہ شاہنامہ خوانی کند

بادشاہ شجاع الملک نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا کہ یہ کون ہے؟ تو نواب صاحب نے جواب دیا کہ یہ پروانہ نویس ہے۔ شجاع الملک نے فرمایا کہ یہ رکن سلطنت وزیر کی قابلیت رکھتا ہے۔ (العزیز، ستمبر ۱۹۴۴ء، ص:۴۸) نواب بہاول خان ثالث کے عہد میں لالہ مولرام میر منشی کی وفات پر چوکس رائے میر منشی مقرر ہوا۔ اور ہمیشہ سفارت اور معتمدی کے اہم اور نازک کام انجام دیا کرتا تھا۔ ۱۹/اکتوبر ۱۸۵۲ء/ ۵ محرم ۱۲۶۹ھ کو جب نواب بہاول خان ثالث کا انتقال ہوا اور

شہزادہ سعادت یار خان نے صادق محمد خان ثالث کے لقب سے مسند نشین ہوکر حکومت کی عنان سنبھالی تو منشی چوکس رائے کو قلمدان وزارت سپرد کیا گیا۔(تاریخ الوزرا،ص:۱۴۔۱۶)

منشی چوکس رائے کے متعلق یہ واقعہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ ایک دفعہ وہ خیر پور دورے پر گئے تو کسی نے ان کی خدمت میں درخواست پیش کی۔انہوں نے درخواست پڑھ کر اس پر یہ مصرع لکھا اور درخواست واپس کر دی۔''سگان خیر پور اندر فسادند''۔لیکن درخواست دہندہ بھی بڑا حاضر جواب تھا۔اس نے منشی چوکس رائے کے مصرع کے جواب میں فی البدیہہ یہ مصرع لکھا:''عنان عدل چون خنزیر دادند''۔کہتے ہیں کہ خیر پور کے متعلق یہ شعر بھی منشی چوکس رائے کا ہے:

آسمان پیر است لیکن در زمین خیر پور
گاہے گاہے ہمچون طفلان خاک بازی می کند

(بہاول پور میں اردو،ص:۴۷)

افسوس کہ چوکس رائے کا کلام امتداد زمانہ کی نذر ہو گیا۔یہ قابل وزیر محلاتی سازشوں اور خانہ جنگی کا شکار ہوا اور ۲۰ فروری ۱۸۵۳ء کو ایک مہم کے دوران گرفتار ہوکر قتل کر دیا گیا۔(تاریخ الوزرا،ص:۱۷)

مولوی محمد اعظم (۱۷۶۹۔۱۸۶۷ء): اس مورخ اور عالم کی تاریخ پیدائش اور وفات کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔اور نہ ہی کسی معاصر صاحب قلم یا محقق نے کسی جگہ ان کے سال وفات یا پیدائش کا اندراج کیا ہے۔حسن میرانی نوشاہی (۱۹۲۶۔۲۰۰۳ء) نے ان کی کتب کے ذریعے جو تاریخیں اخذ کی ہیں ان کے مطابق ان کی پیدائش ۱۷۶۰ میں اور وفات ۱۸۶۷ء میں ہوئیں۔ان کے آبا و اجداد جلال پور کھاکھیاں سے بہاول پور آ کر محلہ طاہر پورہ میں آباد ہوئے۔ان کے والد مولوی محمد صالح، بہاول خان خان ثانی کے اتالیق تھے۔مولوی صاحب تعلیم مکمل کرنے کے بعد دربار سے وابستہ ہوئے اور نواب صادق خان ثانی کے دور میں شاہی مورخ مقرر ہوئے۔مولوی محمد اعظم دارالانشاء کے میر منشی اور شاہزادوں کے اتالیق بھی تھے۔یہ دارالانشا برج ککوہا میں واقع تھا اور مولوی محمد اعظم بھی اسی برج میں رہائش پذیر تھے۔نثر میں انہوں نے ریاست بہاول پور کی تاریخ تذکرۃ الخوانین فارسی زبان میں لکھی جو جواہر عباسیہ کے نام سے معروف ہے۔اس کتاب کا تاریخی نام مقصود اعظم

ہے۔اور یہ بہاول پور کی تاریخ کا معتبر ترین ماخذ ہے۔ جواہر عباسیہ کے خطی نسخوں کی تفصیل درج ذیل ہے:

۱۔ Lindesiana P.192 no 924 (2 vols. in 1 Circ. A.D 1845)

۲۔ نسخۂ لاہور میوزیم، خط شکستہ، ۲۴۱ صفحات پر مشتمل ہے۔اس کی ابتدا میں طلائی لوح ہے اور تمام حاشیے بھی طلائی ہیں۔ یہ نسخہ دو کاتبوں نے تحریر کیا۔اس کا پہلا حصہ منشی سلامت رائے ولد منشی دھنپت رائے نے لکھا جبکہ دوسرا حصہ قمر الدین حکیم، ولد محمد علی حکیم، ساکن پاک پتن شریف نے کتابت کیا۔اس نسخے کے کاتبوں نے تاریخ کتابت ۱۴ محرم بغیر سال کے درج کی ہے۔لیکن نواب بہاول خان ثالث نے اپنے زیر مطالعہ نسخے پر ۲۳/ ربیع الاول ۱۲۵۴ھ کی تاریخ درج کی ہے اور اس کی کتابت بھی اسی تاریخ کے لگ بھگ ہی ہوئی ہوگی۔

مولوی محمد اعظم نے اپنا دیوان مجموعہ اعظم کے نام سے مرتب کیا جس کی کتابت شاہی خطاط، مولوی محمد ہاشم (۱۸۷۸۔ ۱۹۴۳ء) نے ۱۱/ جون ۱۹۱۱ء میں مکمل کی۔ یہ دیوان ۱۶۱ صفحات پر مشتمل ہے۔اس میں فارسی اور اردو کلام شامل ہے۔اس کے علاوہ، نیر اعظم (۱۸۵۵ء)، مجموعۂ اعظم (دیوان، خطی)، اقبال نامہ (خطی، فارسی)، مولود النبی، حلیۃ النبی (فارسی) وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ حلیۃ النبی صادق الانوار پریس بہاول پور سے پنجابی ترجمے کے ساتھ ۱۸۷۹ء میں شائع ہوئی۔اس کا پہلا شعر درج ذیل ہے:

حمد مر خالق محمد راست
کہ جمال محمدی آراست

(کتاب شناسی آثار فارسی چاپ شدہ در شبہ قارہ، ج ۴، ص ۲۴۰۷۔ ۲۴۰۸)

حلیۃ النبی اور مولود شریف تو ان کی زندگی ہی میں طبع ہو گئے تھے۔حسن میرانی نوشاہی لکھتے ہیں کہ ان کے مملوکہ حلیۃ النبی کے مطبوعہ نسخے پر اس کا سال طباعت ۱۲۹۶ھ/ ۱۸۷۹ء درج ہے۔اس میں مولانا کو رحمۃ اللہ علیہ لکھا گیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن ہے، جو ان کی وفات کے بعد طبع ہوا۔(تذکرہ ملوک شاہ، ص:۷۷) اعظم بہاول پوری نے اقبال نامہ نواب صادق خان کے حکم پر تالیف کیا۔اس کتاب میں نواب صادق خان کے دور کے پہلے

چار یا پانچ سالوں اور نواب بہاول ثانی کے آخری دور کے حالات پر مشتمل مفصل تاریخ ہے۔ اس کا ایک خطی نسخہ برٹش میوزیم [OR-۱۷۴۰] میں موجود ہے۔ (Storey, Vol.1, P 161) ایک نسخہ کتب خانہ سلطانی میں بھی موجود تھا [رجسٹر نمبر: ۰۷۷] (فہرست کتب خانہ دولت عالیہ: ص ۳۴) اور اس کے علاوہ نورالزمان اوج (متولد: ۱۹۲۴ء)، بہاول پور کے ذاتی کتب خانے میں بھی اس کا ایک نسخہ موجود تھا جو ناقص الطرفین تھا۔ اعظم کی ایک غزل بطور نمونہ:

تا به جان از اثر باده نشان خواهد بود — جان ما در طلب باده نشان خواهد بود
تا به میخانه ز ساقی دم نوشا نوش است — جام و می برلب و دل نعره زنان خواهد بود
سر پنهان که نیاید به دل اهل صلاح — پیش رندان خرابات عیان خواهد بود
هر که در کوچه جانان به گدای دم زد — صاحب دولت و دارای جهان خواهد بود
دل پر از نور جمالیست که گنجایش او — خارج از حوصله ای کون و مکان خواهد بود
چون به جز یار ندیدیم عیان در دو جهان — کی نگاه دل ما بر دگران خواهد بود
اعظم از یار جدا نیست که انشاء الله — تا دم مرگ به رویش نگران خواهد بود

(مجموعۂ اعظم، ص: ۵۲)

مقدم رائے گلوترہ اترادھی (۱۸۲۵-۱۸۹۸ء): منشی مقدم رائے کے والد منشی جمعیت رائے نہایت قابل شاعر، علم دوست اور صوفی منش بزرگ گذرے ہیں۔ یہ گلوترہ قوم سے تھے اور ذات اترادھی تھی۔ مقدم رائے غیر معمولی قابلیت کے مالک تھے۔ عربی، فارسی، گورمکھی اور سنسکرت کے علاوہ موسیقی شاعری اور انشا پردازی میں بھی بڑی مہارت رکھتے تھے۔ شطرنج بھی خوب کھیلتے تھے اور اکثر مطالعہ کتب تصوف میں منہمک رہتے تھے۔ مولوی محمد بخش سے تحصیل علوم کیا اور فراغت کے بعد تاریخ نویسی کی خدمت پر مامور ہوئے۔ منشی دربار اور میر منشی کے عہدوں پر بھی متمکن رہے۔ کئی اہم ریاستی مہمات اور امور میں شریک کار رہے۔ سرپرست منڈی بہاول پور مقرر ہوئے اور اسی عہدے سے وظیفہ یاب ہوئے۔ خوش نویس، مصنف اور شاعر تھے۔ ''جری'' تخلص کرتے تھے۔ ان کا ایک عربی قصیدہ جشن جمشیدی میں ملتا ہے (جشن جمشیدی، ص: ۵۸)، لیکن فارسی کلام ناپید ہے۔ مولوی عزیز الرحمان کے بقول:

"فارسی زبان میں متعدد کتابیں آپ نے تصنیف کیں جو علم توحید اور تصوف کا بیش بہا اور بے نظیر خزانہ تھا۔ بہاول پور کی تاریخ مرات دولت عباسی کی مطبوعہ کاپی آپ کے نقل شدہ مسودے سے کتابت کی گئی تھی۔ حضرت غوث الثقلین گیلانی کی چند فارسی مناجاتیں، اپنے بچوں کی تاریخ ہای ولادت اور دوسرے اہم واقعات کی کثیر التعداد تاریخیں لکھی ہیں، لیکن افسوس کہ امتداد زمانہ کے باعث کچھ محفوظ نہ رہا"۔ (العزیز، اگست، ۰۴، ص ۴۴۔ ۴۳)

مبارز الدولہ پیر ابراہیم علی: (۱۷۹۴۔۱۸۵۶ء): مبارز الدولہ پیر ابراہیم علی کے اجداد سلطان شہاب الدین غوری (حکومت: ۱۲۰۲۔۱۲۰۶ء) کے عہد میں کوہ فیروزہ اور غزنی سے ہجرت کر کے ملتان آ گئے تھے۔ ناموافق آب وہوا کی وجہ سے یہاں سے قصور منتقل ہو گئے اور راجہ رائے سنگھ کے پاس کام کرنے لگے۔ سلطان بہلول اور سلطان سکندر اور سلطان ابراہیم لودھی کے دور میں اور مغلیہ حکمرانوں کے دور میں بھی نمایاں خدمات سرانجام دیں۔ ابراہیم ۱۷۹۴ء میں پیدا ہوئے اور ۱۸۰۸ء میں قصور پر رنجیت سنگھ کے قبضے کے بعد اپنے خاندان اور عزیز واقارب کے ساتھ ممدوٹ ہجرت کی اور پھر وہاں سے شاہ جہاں آباد دہلی آ گئے۔ وہاں طب کی تعلیم حاصل کی۔ ۱۸۳۷ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی میں ملازم ہوئے اور ۱۸۴۰ء میں کمپنی کے نمائندے کی حیثیت سے بہاول پور کے دربار میں متعین ہوئے۔ دریائے ستلج کے ریجنٹ ہوئے۔ جون ۱۸۴۰ء تک کیپٹن طامس کی جگہ ریاست بہاول پور کے نیٹو ایجنٹ مقرر ہوئے۔ ۲۴/ مارچ ۱۸۴۶ء میں لارڈ ہارڈنگ نے ان کی خدمات کے صلے میں خلعت اور "خان بہادر" کے خطاب سے نوازا۔ ۲۹/ مئی ۱۸۵۲ء کو گورنر جنرل نے انہیں "مبارز الدولہ" کا خطاب دیا۔ (سیرستان: ص ۲۱۸)

تصنیف و تالیف سے خاص رغبت رکھتے تھے۔ انہوں نے ۱۸۵۴ء میں سیرستان مبارز الدولہ کے نام سے فارسی زبان میں ایک کتاب لکھی، جو سیرستان کے نام سے مشہور ہے۔ اس کتاب کا بیشتر حصہ ان کے سفر انگلستان کے واقعات سے متعلق ہے جب کہ اس کتاب کے باب چہارم میں بہاول پور کے جغرافیائی وتمدنی حالات سے متعلق اپنے چودہ سالہ دور ملازمت کے دوران اپنے مشاہدات، تاثرات اور تجربات تحریر کیے ہیں۔ (ر۔ک: دو منبع مہم فارسی درزمینۂ تاریخ امارت

بہاول پور،ص:۱۱۸۔۱۲۳)۲۳۷ صفحات پر مشتمل یہ کتاب منشی محمد مہدی خان کے اہتمام سے مطبع ریاض نور سے شائع ہوئی۔ پیر ابراہیم نے کتاب کے آخر میں درج ذیل قطعہ تاریخ لکھا:

چو تائید خدا کردہ ہدایت مرتب شد کتاب بر درایت
کتاب دل پذیری ، بی نظیری پسند افتاد ہر کس را بغایت
شدہ تشہیر آن شہری بہ شہری شدہ مقبول دل ہا بی نہایت
بہ تاریخ تمامش ہاتف از غیب ۱۲۷۰ھ بہ گفتا زیب اخبار ولایت
سن ہجدہ صد و پنجاہ و ہم چار ۱۸۵۴ ز سال عیسوی آمد بغایت

(سیرستان،ص:۲۳۷)

مولوی حفیظ الرحمان (۱۸۹۶۔۱۹۵۹ء) نے سیرستان کے اس باب کا اردو ترجمہ کیا اور اس کے ساتھ اپنے دور کی تمدنی زندگی یعنی ۷۵ سال بعد کے حالات پر روشنی ڈال کر ۱۹۳۲ء میں اسے تمدن بہاول پور کی دو مختلف تصویریں کے نام سے محبوب المطابع دہلی سے شائع کیا۔

پنڈت لعل جی پرشاد (وفات:۱۸۷۸ء): پنڈت لعل جی پرشاد ذات کے کائستھ اور کشمیری پنڈت تھے۔ وطن دہلی تھا۔ والد کا نام پنڈت جواہر لعل تھا جو علاقہ انگریزی کے تحصیل دار تھے۔ ۱۸۷۶ء میں منچن آباد کے ناظم تھے۔ منٹگمری کی تحصیل داری سے وہ بہاول پور میں عہد نظامت پر فائز ہوئے تھے۔ منچن آباد کی نظامت کی خدمات سرانجام دیں۔ جب سید مراد شاہ گردیزی کی وفات ہوئی تو پنڈت لعل جی پرشاد کو جج اول، صدر عدالت مقرر کیا گیا۔ (تاریخ مراد، خطی، ص ۱۷۰) کچھ عرصہ بطور اسسٹنٹ پولیٹیکل ایجنٹ کے خدمات بھی انجام دیتے رہے۔ نومبر ۱۸۷۷ء میں وزیر ہوئے۔ ۲۳ جولائی ۱۸۷۸ء کو بہاول پور میں ہی انتقال کیا۔ وہ ایک محنت کش، عقل منداور مدبر وزیر تھے۔ عربی فارسی کی لیاقت کے علاوہ شعر گوئی میں انہیں اچھا دخل تھا۔ ۱۰؍جنوری ۱۸۹۵ء کے صادق الاخبار میں ان کی قابلیت کا اعتراف اور شاعری کا نمونہ دیا گیا ہے۔ جو ذیل میں نقل کیا جاتا ہے:

”پنڈت لعل جی پرشاد وزیر بہاول پور ایک مشہور لائق آدمی تھے۔ شعر گوئی میں انہیں اچھا دخل تھا۔ عجیب تر یہ ہے کہ انتقال سے دو دن پہلے انہوں نے یہ پر عبرت شعر تصنیف کیے اور تیسرے دن جہاں سے چل دیے“۔

پنڈتا ! دشمن تواند چہار — طمع و حرص و غفلت و پندار
گر ازین چار بر کران باشی — دود ز آفات و در اماں باشی
ظلم گیر گیج و غفلت شیخان — ص(؟) یعقوب و فخر احمد خان
قصۂ چوکس و سراج و نظام — عجز حاجی شنیدہ ام بہ تمام
چشم عبرت کشا و غرہ مباش — تخم نیکی درین زمین می پاش
تاکہ بعد از تو در بہاول پور — خلق گوید کہ بود خوش دستور
زندگانی ہمیں دم چند است — عاقبت کار با خدا وند است

(العزیز جنوری ۱۹۴۲ء، ص ۳۱؛ تاریخ الوزراء، ص ۳۰)

سید مراد شاہ گردیزی (۱۸۱۰۔۱۸۷۶ء): ریاست میں نیٹو ایجنٹ، ناظم اور چیف جج کے عہدوں پر فائز رہے۔ یکم اپریل ۱۸۷۰ء سے ریاست بہاول پور میں اختیارات کے اعتبار سے سب سے بڑی عدالت، صدر عدالت کا قیام عمل میں لایا گیا۔ یہ عدالت تین ججوں پر مشتمل تھی جو منصبی اعتبار سے صدر جج یا جج اول، جج دوم اور جج سوم کہلاتے تھے۔ آغاز میں ان عہدوں پر بالترتیب سید مراد شاہ گردیزی، مولوی شمس الدین اور سید محمد نواز شاہ کا تقرر ہوا۔ (صادق الاخبار، ۲۰/ مارچ، ۱۸۷۱ء، ص ۴) سید مراد شاہ کا تعلق ملتان کے گردیزی خاندان سے تھا۔ انہوں نے اردو زبان میں پانچ جلدوں پر مشتمل تاریخ مراد تحریر کی جو بہاول پور کی تاریخ پر اردو زبان کا سب سے پہلا ماخذ ہے۔ یہ تاریخ ۱۸۶۷ء اور ۱۸۷۵ء کے دوران لکھی گئی لیکن مراد شاہ کی اچانک وفات کی وجہ سے شائع نہ ہوسکی۔ اس کی جلد پنجم میں خصوصاً نواب بہاول خان ثالث کی تخت نشینی (۱۸۶۵ء) سے لے کر نواب بہاول خان رابع کی وفات (۲۵/ مارچ ۱۸۶۶) تک کے حالات درج ہیں۔ یہ جلد ۴۰۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کے عنوانات فارسی میں ہیں اور متن اگرچہ اردو میں ہے لیکن تاریخ مراد کی اردو پر فارسی کی گہری چھاپ ہے جس سے صاف واضح ہوتا ہے کہ گویا فارسی کے بطن سے اردو جنم لے رہی ہے۔ تاریخ مراد کی نثر سے پتا چلتا ہے کہ اس وقت تک اردو تحریر میں روانی نہیں آئی تھی اور فارسی کے اثرات باقی تھے۔ فقروں کی ساخت بھی فارسی آمیز اور الفاظ بھی زیادہ تر فارسی کے استعمال کیے گئے ہیں۔ (بہاول پور میں اردو، ص ۱۱۵) تاریخ مراد کی جلد پنجم ان کے پڑپوتے

علی عباس ابن حرریاحی گردیزی نے ڈاکٹر شوکت محمود کی تدوین اور ڈاکٹر اسد اریب کے مقدمہ کے ساتھ ۲۰۱۴ء میں عباس کوشک، الطاف ٹاؤن، ملتان سے شائع کی۔ اصل مسودے کا عکس بھی اس کتاب میں شامل ہے۔

شیخ محمد فیروز الدین (وفات: ۱۸۸۰ء): شیخ محمد فیروز الدین ۱۸۶۶ء میں تحصیل دار مقرر ہوئے۔ پانچ سال کے بعد وہ ریاست بہاول پور کے پولیٹیکل ایجنٹ منچن صاحب کے کلکٹر رہے پھر ریاست بہاول پور کے سیشن جج ہو گئے۔ اور ۱۸۷۸ء میں پنڈت لعل جی پرشاد کی وفات پر وزارت کے عہدے پر ترقی پائی۔ نواب صادق خان رابع کی مسند نشینی ان کے زیر اہتمام بہت خوبی سے انجام پائی۔ دو سال کی خدمت بہاول پور کے بعد ۱۸۸۰ء کو لاہور میں وفات پائی۔ ان کی تاریخ وفات: ''کرد رحلت از جہان فیروز دین'' (۱۲۹۷ھ) نکالی گئی۔ (تاریخ الوزرا، ص ۳۲۔ ۳۳)

شیخ محمد فیروز الدین صاحب کی علمی قابلیت بھی نہایت اعلیٰ تھی۔ وہ مخیر، خوش بیان اور فقیر دوست تھے۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی علیہ الرحمۃ کے ساتھ ان کا اعتقاد عشق تک پہنچا ہوا تھا۔ (تاریخ الوزراء، ص ۳۴) صاحب دیوان شاعر تھے۔ اشعار ملاحظہ ہوں:

خدارا راحت جان شو بیا ای گل عذار من — کہ تا گلشن شود ایں خاطر پر خار خار من
منم مقتول گلرویان ہزاران داغ دل دارم — بروید دستہ ہای لالہ از خاک مزار من
گذاری گر قدم بر مرقدم ای یوسف ثانی — بگیرد دامن پیراہنت مشت غبار من
بخندہ و برق بر آہ فلک سوز جگر دوزم — بگرید ابر بر حال دو چشم اشکبار من
بہر صحرا تو مجنونی بہر مہر و تو مفتونی — عجب بیگانہ وش یاری تو ای دل در کنار من
بہ لوح دل نمی کردم بجز از عشق تحریری — اگر روز ازل بودی قلم در اختیار من
اگرچہ کمتر از خاکم ولی فیروز آفاقم — غلام احمد پاکم ہمین بس اختیار من

(دیوان فیروز، ص: ۴۵)

(باقی)

متنبی کی شاعری کا تحقیقی مطالعہ

پروفیسر محمد انس حسان

(۲)

۱۵۔ہجوگوئی: مضامین شعر کو علماء نے چار قسموں میں منحصر مانا ہے۔(۱) نسیب (عشقیہ) (۲) فخریہ (۳) مدحیہ (۴) ہجویہ۔ہجوگوئی کوئی مناسب عمل نہیں لیکن عرب شاعری میں اس صنف پر قدرت نہ ہونا عیب تصور ہوتا تھا۔شعراء میں بہت کم ایسے لوگ گذرے ہیں جنھوں نے مذکورہ بالا چاروں میدانوں کو فتح کیا۔اور تو اور شعرائے عربی کے آفتاب و ماہتاب جریر و فرزدق کو لیجیے۔جریر افتاد طبع کے رو سے فخریہ نہیں کہہ سکتا اور فرزدق کے متعلق جاحظ تک کو سخت تعجب ہے کہ وہ رند ہو کر نسیب اچھی نہیں کہہ سکتا جبکہ جریر خشک ملا ہو کر غزل خوب کہتا ہے۔ہجوگوئی میں متنبی درجہ کمال کو پہنچا ہوا ہے۔اس کی ہجو نہایت سخت، دل دوز اور اضطراب انگیز ہوتی ہے۔مثلاً صنبہ نامی ایک شخص کی ہجو میں کہتا ہے:

ان اوحشتک المعالی فانها دار غربة
او انستک المخازی فانها لک نسبة

''اگر بزرگی کے کارنامے تجھے وحشت میں ڈالیں (تو کیا تعجب ہے) کیونکہ وہ تیرے لیے بہ منزلہ دار غربت کے ہیں اور اگر تو رسوائی کے کاموں سے مانوس ہے (تو کوئی حیرت نہیں) کیونکہ وہ تیرے ہم نسب ہیں''۔

متنبی کا یہ ہجویہ قصیدہ اتنا فحش ہے کہ اس کے دیگر اشعار کی نسبت یہ دو شعر مدحیہ معلوم ہوتے ہیں۔چنانچہ خود متنبی کو بھی بعد میں ان اشعار کا سننا سنانا گوارا نہیں تھا۔(۲۴) حالانکہ اس بے چارے کا قصور صرف اتنا تھا کہ اس نے متنبی کی خاطر خواہ مہمان نوازی نہیں کی تھی اور بالآخر یہی قصیدہ متنبی کے

گورنمنٹ ڈگری کالج جہانیاں، پاکستان۔

لیے جان لیوا ثابت ہوا۔کافور کی ہجو میں کہتا ہے:

العبد لیس لحر صالح باخ لو انه فی ثیاب الحر مولود

''غلام کسی آزاد آدمی کا بھائی نہیں ہوسکتا اگر چہ وہ آزاد آدمی کے کپڑوں میں پیدا ہو''۔

لقد کنت احسب قبل الخصیی ان الرؤس مقر النھی

فلما انتھینا الی عقله رایت النھی کلھا فی الخصی

''میں اس خواجہ سرا کو دیکھنے سے پہلے سمجھتا تھا کہ عقل کا ٹھکانہ سر ہے۔سو جب میں نے اس کی عقل کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ ساری عقل خصیوں میں رہتی ہے (جب اس کے خصیے کاٹ ڈالے گئے تو عقل بھی جاتی رہی)''۔

متنبی جب سیف الدولہ سے ناراض ہوکر چلا تو کافور نے بہت سے خوش آئندہ وعدے کر کے اور حکومت دلانے کا سبز باغ دکھا کر اس کو مصر بلوایا۔مگر متنبی کی ذہانت اور بہادری دیکھ کر اسے خطرہ پیدا ہوا کہ اگر اس کو مصر کے کسی علاقے کا حاکم مقرر کردوں تو بعید نہیں کہ کل کو خودمختاری کا دعویٰ کردے۔چنانچہ جب کافور کے بعض مصاحبین نے اس کو وعدہ یاد دلایا تو اس نے جواب میں کہا کہ لوگو! جو شخص محمد رسول اللہؐ کے بعد نبوت کا مدعی بن بیٹھا اس پر میں کیوں کر اعتماد کرسکتا ہوں کہ کل کو موقع پاکر وہ میرے ساتھ حکومت میں شرکت کا مدعی نہیں ہوگا۔(۲۵) متنبی ناراض ہوکر مصر سے چلا آیا اور کافور کی متعدد ہجویں کہہ کر اپنے دل کی بھڑاس نکالتا رہا۔اس کے ہجویات سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ کافور ایک نکما اور بے وقوف شخص تھا بلکہ اس کی حیثیت ایک مجسمے اور بت سے زیادہ نہیں تھی۔حالانکہ جب ہم کافور کی سوانح دیکھتے ہیں تو وہ ایک نہایت مدبر، عالی ہمت، بلند حوصلہ اور دانش مند شخص گذرا ہے۔بہر کیف اسحٰق بن ابراہیم اعور بن کیغلغ کی ہجو میں کہتا ہے:

وتراہ اصغر ما تراہ ناطقا ویکون اکذب ما یکون و یقسم

واذا اشار محدثا فکانه قرد یقھقه او عجوز تلطم

یقلی مفارقة الاکف قذاله حتی یکاد علی ید یتعمم

''اور جب تو اسے بولتا ہوا دیکھے تو وہ تجھے نہایت حقیر معلوم ہوگا اور سب سے زیادہ جھوٹا جب ہوگا جب قسم کھائے گا۔اور جب وہ بولتے وقت اشارہ کرتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا بندر ہنس رہا ہے یا بڑھیا منہ پیٹتی ہے۔وہ اپنی کھوپڑی سے ہتھیلیوں کی جدائی کو برا جانتا ہے یہاں تک کہ قریب ہے کہ (اس شوق میں) ہاتھ

پر بھی عمامہ باندھے (تاکہ لوگ اسے بھی سر سمجھ کر اس پر طمانچہ رسید کریں)''۔

۱۶۔حسن کنایہ اور شرح ملیح: ایک جگہ قاصد کے اظہار شوق کی تکذیب کررہا ہے۔مگر تصریح نہیں کرتا بلکہ کنایہ کے طور پر مضمون کو ادا کرتا ہے۔

تشتکی ما اشتکیت من الم الشو ق الیھا و الشوق حیث النحول

''(اے قاصد) تو بھی شوق کا وہی شکوہ کرتا ہے جو میں کرتا ہوں۔حالانکہ تو جھوٹا ہے کیونکہ شوق وہاں ہوتا ہے جہاں لاغری ہوتی ہے (جب تو لاغر نہیں تو شوق کیسا)''۔

شعر ذیل میں متنبی نے حشو استعمال کیا۔مگر حشو قبیح نہ ہونے دیا بلکہ اس حشو نے بجائے خود شعر میں ایک تازگی پیدا کردی جو اس کی قادر الکلامی کی دلیل ہے:

صلی الالہ علیک غیر مودع و سقی ثری ابویک صوب غمام

''خدا تجھ پر رحمت کرے اور مجھ کو تجھ سے جدا نہ کرے اور تیرے ماں باپ کی قبر کو بارش تر کرے۔''

اس میں ''غَیْرَ مُوَدِّعٍ''حشو ہے۔مگر یہی حشو ملیح شعر کی روح ہے۔

وتحتقر الدنیا احتقار مجرب یری کل ما فیھا و حاشاک فانیا

''اور تو دنیا کو اس تجربہ کار شخص کی طرح حقیر جانتا ہے جو تمام کائنات کو آپ کے علاوہ فانی سمجھتا ہے''۔

لفظ حَاشَاکَ نے جو حشو ملیح ہے مضمون شعر کو کس قدر بلند کردیا ہے۔

متنبی کی شاعری کے عیوب اور خامیاں: اب ہم متنبی کے کلام کے کمزور پہلوؤں کی وضاحت کرتے ہیں۔

ومن ذالذی ترضی سجایاہ کلھا کفی المرءنبلا ان تعد معائبہ

''ایسا کون ہے جس کے سب اخلاق پسندیدہ ہوں۔کسی آدمی کے شرف و بزرگی کے لیے یہ کافی ہے کہ اس میں گنتی کے عیوب ہوں''۔

۱۔مطلع کی رکاکت: سب سے اول ہم قبح مطلع کو لیتے ہیں۔قصیدہ کا مطلع الفاظ کے اعتبار سے عمدہ،شستہ اور شیریں ہونا چاہیے۔نیز اس کے معنوں میں جودت اور ندرت کا ہونا ضروری ہے کیونکہ مطلع ابتدائی قوت سامعہ کو وجد میں لاتا ہے۔پس اگر مطلع ہی رکیک اور سست ہو تو کان کو اس پورے قصیدہ کو سننا ہی گوارا نہ ہوگا۔چہ جائے کہ وہ کسی کے دل میں اتر سکے اور اس کی مثال ایسی ہوگی

جیسے عوام میں مشہور ہے دیگ کے سر پر تلچھٹ۔

الف: متنبی کے بعض مطلع ایسے رکیک اور سست ہیں جن کو اس کے نکتہ چینوں کی رائے کا استصواب کرتے ہوئے چار و ناچار ان کے معیوب اور ناقص ہونے پر صاد کرنا پڑتا ہے۔کان ان کے سننے اور دماغ ان کے محفوظ کرنے سے گھبراتے ہیں۔(۲۶) مثلاً متنبی محمد بن زریق کی مدح میں کہتا ہے:

هذی برزت فهجت رسیسا ثم انثنیت وما شفیت نسیسا

''اے محبوبہ تو میرے سامنے جب جلوہ آرا ہوئی۔تو تو نے اس محبت کو جو تپ کی طرح دل میں پوشیدہ تھی اور بھڑکا دیا۔پھر تو جدا ہوئی اور میری بقیہ جان کو شفا نہ دی''۔

شعر مذکورہ بالا میں لفظ هذی دراصل یا هذی تھا۔متنبی نے نحوی قواعد کے برخلاف (محض ضرورت کے پیش نظر) حرف نداء کو حذف کر دیا۔پھر اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ''رسیس'' اور ''نسیس'' جیسے دو انتہائی ثقیل اور بھدے لفظ لا کر شعر کو بالکل خاک میں ملا دیا۔

ب: متنبی میں سب سے بڑا عیب یہ ہے کہ وہ رجز کی زبان کو قصائد میں بے تحاشا اس لیے استعمال کرتا ہے تاکہ سامعین اس کی وسعت علمی سے مرعوب ہوں۔حالانکہ قصیدہ کی زمین رجز کی زمین سے بالکل جداگانہ ہے۔مثلاً متنبی نے عضدالدولہ کی مدح میں کہا ہے:

اوه بدیل من قولتی واها لمن نات والبدیل ذکراها

اوه من ان لا اری محاسنها واصل واها واوه مرآها

''اب بجائے واہ کے میری زبان پر لفظ آہ ہے اور بہ سبب اس کے ہجر کے اس کی یاد ورد زبان ہے۔آہ وہ محبوبہ جس کی خوبیاں اب مجھ کو نظر نہیں آتیں اور آہ اور واہ کی اصل دیدارِ محبوب ہے''۔

متنبی یہاں عضدالدولہ کی عجمیت کو اپنی عربیت سے مرعوب کرنا چاہتا ہے۔

ج: متنبی نے سیف الدولہ سے ناراض ہو کر کافور کے دربار میں پہلی ملاقات میں پہلا قصیدہ ان الفاظ سے شروع کیا:

کفی بک داء ان تری الموت شافیا وحسب المنایا ان یکن امانیا

''تجھ کو اس قدر مرض کافی ہے کہ موت کو کافی سمجھنے لگے اور موتوں کو یہ کافی ہے کہ وہ (لوگوں کی) آرزوئیں بن

جائیں (آرزو مرغوب چیز کی کی جاتی ہے)''۔

حالانکہ ابتدائے کلام میں مرض، موت اور اجل کی بدشگونی کو ایک عامی بھی سننا گوارا نہیں کرسکتا۔ چہ جائیکہ سریر آرائے سلطنت اس سے خوش ہوسکے۔

د: متنبی علی بن ابراہیم تنوخی کی تعریف میں کہتا ہے:

احاد ام سداس فی احاد لییلتنا المنوطة بالتناد

''یہ ہماری لمبی رات جو قیامت سے ملی ہوئی ہے۔ ایک رات ہے یا چھ راتیں۔ ایک سے جڑی ہوئی ہیں (یعنی کامل ہفتہ اور سارا زمانہ۔ کیونکہ زمانہ ہفتوں سے بنا ہوا ہے)''۔

متنبی کا یہ مطلع ایسا ہے جس کا کوئی سر پیر نہیں۔ اس مطلع میں اس نے حساب دانی کے ایسے جوہر دکھائے ہیں جو نہ تو قواعد حساب سے حل ہوسکتے ہیں نہ علم اعداد کے اصول وضوابط کے مطابق ہیں۔

ھ: سیف الدولہ کے سامنے اس کے غلام یماک کا مرثیہ پڑھتے ہوئے کہتا ہے:

لا یحزن اللہ الامیر فاننی لآخذ من حالاتہ بنصیب

''خدا امیر کو غمگین نہ کرے۔ کیونکہ میں اس کے شادی وغم دونوں میں سے حصہ لیتا ہوں (اور میں یہ نہیں چاہتا کہ مجھے اس کی جانب سے غم ملے)''۔

۲۔عدم تسلسل: متنبی کی ایک قابل گرفت عادت یہ ہے کہ وہ نفیس سے نفیس اور عمدہ سے عمدہ شعر کہتا ہوا اچانک ایسا سست اور رکیک کلام کہنے پر اتر آتا ہے جس سے قصیدہ کی تمام آب وتاب ملیامیٹ ہوجاتی ہے۔ اس وقت اس پر یہ مثل بالکل چسپاں نظر آتی ہے:

انت العروس لها جمال رائق لکنها فی کل یوم تصرع

''تو وہ دلہن ہے جس کا جمال تو دلفریب ہے۔ لیکن اس کو روزانہ مرگی کا دورہ پڑتا ہے''۔

ایسے موقع پر بلا مبالغہ ہم اسے اس مجنوں سے تشبیہ دے سکتے ہیں جو نہایت عاقلانہ اور حکیمانہ باتیں کہتا ہوا ناگہانی طور پر بہک جاتا ہے۔ مثلاً اس کے ایک قصیدہ کا مطلع ہے:

اتراها لکثرة العشاق تحسب الدمع خلقة فی المافی

''کیا تو محبوبہ کو دیکھتا ہے کہ وہ کثرت عشاق (اور ان کے گریہ پیہم) سے یہ سمجھنے لگی ہے کہ آنسو گوشۂ چشم میں ہی

پیدا ہوتے ہیں''۔

یہ مطلع نہایت نفیس اور جدت مضمون کی اعلیٰ مثال ہے۔ مگر اس کے بعد ہی کہتا ہے:

كيف ترثي التي ترى كل جفن رآءها غير جفنها غير راق

''وہ محبوبہ جس نے اپنی آنکھ کے سوا ہر آنکھ کو آنسوؤں سے بہتا ہوا دیکھا ہے کیوں کر رحم کرے گی (کیونکہ وہ سمجھتی ہے کہ آنسو گوشۂ چشم میں پیدا ہوتے ہیں)''۔

یہ شعر تعقید لفظی، بندش کی سستی اور تکرار لفظ ''غیر'' وغیرہ کے باعث اگر دیوان سے نکال پھینکا جائے تو کسی باذوق شخص کو اس پر افسوس نہیں ہوگا۔ (۲۷) اسی طرح ایک اور قصیدے میں بہترین مضامین بیان کرتا ہے۔ جس کا ایک شعر یہ ہے:

قد كنت اشفق من دمعي على بصري فاليوم كل عزيز بعدكم هانا

''پہلے تو مجھے رونے سے بینائی جانے کا خطرہ تھا۔ مگر اب تمہارے بعد ہر عزیز شے میری آنکھوں میں ذلیل ہوگئی ہے (خوب روؤں گا)''۔

شعر کے لاجواب ہونے میں کلام نہیں ہوسکتا مگر اس کے بعد اسے تعلی کی جو سوجھی ہے تو تمام شعراء سے بڑھنے کے لیے سواری کے مضمون کو نہایت ناموزوں طریقہ سے بیان کر گیا ہے۔ کہتا ہے:

لو استطعت ركبت الناس كلهم الى سعيد بن عبد الله بعرانا

''اگر میرے بس میں ہو تو تمام لوگوں کو اونٹ بنا کر ان پر سوار ہو کر سعید بن عبداللہ کے پاس چلا جاؤں''۔

واضح رہے کہ غالباً خود متنبی کو بھی اس کا احساس ہوا ہے۔ شاید اسی لیے استدراک کے طور پر کہتا ہے:

فالعيس اعقل من قوم رايتهم عما يراه من الاحسان عميانا

''کیونکہ اونٹ اس قوم سے زیادہ ہوشیار ہیں۔ جو احسان کے ان راستوں سے جن کو ممدوح بخوبی جانتا ہے بالکل اندھے ہیں''۔

پھر اسی قصیدے میں اس قسم کے واہی تباہی اشعار کہنے کے بعد جب مدح شروع کی ہے تو نہایت عمدگی سے مضمون باندھا ہے۔ کہتا ہے:

ان کوتبوا او لقوا او حوربوا وجدوا　　فی الخط و اللفظ و الھیجاء فرسانا
کان السنھم فی النطق قد جعلت　　علی رماحھم فی الطعن خرصانا
کانھم یردون الموت من ظما　　او ینشقون من الخطی ریحانا

''اگر ان سے کتابت اور خطابت اور جنگ میں موازنہ کیا جائے تو وہ خط اور تقریر اور جنگ میں شہسوار نکلیں گے۔ گویا ان کی زبانیں بولنے میں ایسی تیز ہیں جیسے بہ وقت نیزہ زنی ان کے نیزوں کے بھالے۔ گویا وہ لوگ موت کے گھاٹ پر ایسے اترتے ہیں جیسے کوئی پیاسا پانی پر اور خطی نیزے سے ریحان کی خوشبو سونگھتے ہیں''۔

اس کے بعد عادت سے مجبور ہو کر کہتا ہے:

خلائق لو حواھا الزنخ لانقلبوا　　ظمی الشفاہ جعاد الشعر غرانا

''ان کے اخلاق ایسے ہیں کہ اگر وہ زنگیوں میں پائے جائیں تو ان کے ہونٹ باریک اور بال گھنگھریالے اور چہرے سفید ہو جائیں''۔

۳۔تعقید لفظی: متنبی کے منجملہ عیوب میں سے ایک یہ ہے کہ وہ نامانوس الفاظ اور تعقید لفظی سے بچ نہیں سکا۔ یہ بھی اس کی بگڑی ہوئی سواریوں میں سے ایک سواری ہے۔ جس کے کوہان پر بیٹھ کر وہ ناہموار راستوں میں ٹھوکریں کھاتا پھرتا ہے۔ خود بھی گمراہ ہوتا ہے اور دوسرے کو بھی گمراہ کرتا ہے۔ تھک جاتا ہے اور تھکا دیتا ہے اور کامیابی کا منہ نہیں دیکھ سکتا۔ (۲۸) مثلاً اپنی سانڈنی کے متعلق کہتا ہے:

فتبیت تسئد مسئدا فی نیھا　　اسادھا فی المھمہ الانضائ

''سو وہ ناقہ ایسے حال میں رات گذارتی ہے کہ اس کی چربی میں لاغری ایسے دوڑتی ہے جیسی وہ بیابان میں دوڑتی ہے''۔

شعر میں تعقید لفظ کی عریانی دیکھیے۔ اگر شعر کو اپنی اصلی صورت میں لایا جائے تو عبارت یوں ہوگی فتبیت تسئد مسئدا الانضائ فی نیھا اسارھا فی المھمہ۔ مگر متنبی نے تقدیم و تاخیر کر کے شعر کو چیستان بنا دیا۔ (۲۹) پھر تُسئِدُ مُسئِداً اِسآرَھَا کی تکرار بھی مذاق سلیم کو گوارا نہیں۔ ایک دوسرا شعر ہے:

انی یکون ابا البرا یا آدم　　وابوک والثقلان انت محمد

”آدم تمام لوگوں کا باپ کیوں کر ہے حالانکہ تیرا باپ محمد ہے اور تو بذات خود جن وانس کا مجموعہ ہے“۔

اس شعر میں بھی تعقید لفظی ہے۔ اصل میں یوں ہونا چاہیے تھا: انی یکون آدم ابا البرایا۔ وابوک محمد و انت الثقلان۔

۴۔اعراب ولغت کی اغلاط: متنبی شعر کی دھن میں لغت اور اعراب دونوں کی پرواہ نہیں کرتا۔ ہر چند کہ متنبی کی طرف سے شراح اور دوسرے علما نے توجیہات کیں۔ شاعر کا کام الفاظ کو بدلنا اور نئے الفاظ کو وضع کرنا نہیں ہے بلکہ قوم کی زبان میں خیالات کی مصوری کرنا ہے۔ متنبی کی اس غلطی کی مثال ملاحظہ ہو۔ حسین بن اسحاق تنوخی کی مدح میں کہتا ہے:

فدی من علی الغبرائ اولھم انا لھذا لابی الماجد الجائد القرم

”اس برے کاموں سے بچنے والے شریف سخی سردار پر تمام روئے زمین پر رہنے والے قربان اور سب سے پہلے میں“۔

شعر مذکور میں لفظ ”جائد“ متنبی نے خود گھڑا ہے۔ مادۂ ”جود“ سے ”جواد“ آیا ہے، مثلاً فرس جواد، رجل جواد، مطر جواد کہتے ہیں مگر جائد نہیں سنا گیا ہے۔(۳۰) اسی طرح ملاحظہ ہو:

شدید البعد من شرب الشمول ترنج الھند او طلع النخیل

”ترنج ہندی اور کھجور کا شگوفہ مے نوشی کے شایانِ شان نہیں ہے“۔

حالانکہ صحیح لفظ ”اترج“ ہے۔”ترنج“ از قبیل غلط العوام ہے۔

لیس الاک یا علی ھمام سیفه دون عرضه مسلول

”اے علی تیرے سوا کوئی ایسا سردار نہیں ہے۔ جس کی شمشیر برہنہ اس کی آبرو کی محافظ ہو“۔

دوسرے موقع پر کہتا ہے:

ثم تر من نارمت الا کا لاسوی ودک لی ذاکا

”(اے ممدوح) تو نے ایسا کسی شخص کو نہیں دیکھا۔ جس کے ساتھ میں نے ہم نشینی اختیار کی ہو۔ بجز تیرے کیونکہ تیری مجھ سے محبت ہے“۔

مذکورہ بالا دونوں شعروں میں نحوی غلطی ہے۔ کیونکہ ”الا“ کے ساتھ ضمیر خطاب کو متصل

کرکے لایا گیا ہے۔ حالانکہ ایسے موقع پر انفصال ضروری ہے۔ جیسے قرآن شریف میں ہے ''ضَلَّ مَنْ تَدْعُوْنَ اِلَّا اِیَّاہُ''۔(۳۱) اسی طرح ملاحظہ ہو:

لعظمت حتی لو تکون امانة ما کان مؤتمنا بھا جبرین

''تو اتنا بڑا ہے کہ اگر تجھے امانت کہا جائے۔ تو اس کا امانت دار جبریل امین بھی نہ ہو سکے''۔

یہ شعر لغت میں ناجائز دست اندازی کا بدترین نمونہ ہے۔ جبریل کے لام کو نون سے بدلنا منون (موت) سے بھی بدتر ہے۔(۳۲)

۵۔ قواعد عروض کا سقم: متنبی بعض اوقات قواعد عروض کا لحاظ بھی نہیں کرتا جس پر شعر کی صحت و سقم کا مدار ہے۔ مثلاً ابوالفرج احمد بن حسین کی مدح میں کہتا ہے:

تفکرہ علم و منطقه حکم وباطنه دین وظاھرہ ظرف

''اس کا تفکر علم ہے اور اس کی بات (سراپا) حکم ہے اور اس کا باطن دین اور ظاہر خوش روی ہے''۔

اس شعر میں عروضی غلطی یہ ہے کہ بحر طویل کا عروض سوائے تصریح کے کبھی بھی ''مفاعیلن'' سالم نہیں آتا بلکہ ''مفاعلن'' (مقبوض) آنا ضروری ہے مگر متنبی نے باوجود تصریح نہ ہونے کے ''مفاعیلن'' کو سالم استعمال کیا۔

۶۔ نامانوس الفاظ کا استعمال: متنبی کبھی کبھی غریب اور بالکل نامانوس الفاظ لاتا ہے حالانکہ وہ متاخرین شعراء میں سے ہے جن کی زبان میں متقدمین کی نسبت زیادہ گھلاوٹ اور سلاست ہے۔ مثلا:

بساحیه علی الاجداث حفش کایدی الخیل ابصرت المخالی

''وہ پراگندہ بادل زمین کو بسبب شدت بارش کے ایسا ادھیڑتا ہے۔ جیسے گھوڑوں کے پاؤں جبکہ وہ توبرے دیکھ لیتے ہیں''۔

ساحی کے معنی پراگندہ اور حفش زور سے گر پڑنے کو کہتے ہیں۔ شعر مذکور میں یہ دونوں لفظ بالکل غریب اور نامانوس ہیں۔ کبھی کبھی تو متنبی ایسے شاذ کلمے اور الفاظ کہہ دیتا ہے (۳۳) جس سے گمان گذرتا ہے کہ اس نے تمام عمر خیموں میں اونٹ کا دودھ پی پی کر گذاری ہے اور کبھی آبادی کی صورت ہی نہیں دیکھی۔ مثلاً لفظ (توراب) اس شعر میں:

ایفطمه التوراب قبل فطامه ویاکله قبل البلوغ الی الاکل

''کیا اس بچے کے دودھ چھوڑنے سے پہلے قبر کی مٹی اس کا دودھ چھڑا دے اور کھانے کے وقت تک پہنچنے سے پہلے مٹی اسے کھا جائے''۔

۷۔عجیب وغریب جمعیں: مزید برآں کبھی کبھی نہایت عجیب وغریب اور بے انتہا مضحکہ خیز جمعیں لاتا ہے۔مثلاً

الف: (اروضٌ) کی جمع اس شعر میں:

اروض الناس من ترب و خوف وارض ابی شجاع من امان

''دیگر لوگوں کی زمینیں مٹی اور خوف سے بنی ہیں اور ابوشجاع کی زمین امن وامان سے بنی ہے''۔

ب: (لُغی) لغت کی جمع۔اس شعر میں:

علیم باسرار الدیانات و اللغٰی

''وہ دینوں اور زبانوں کا راز دان ہے''۔

ج: (دُنی) دنیا کی جمع اس شعر میں:

اعز مکان فی الدنی سرج سابح وخیر جلیس فی الزمان کتاب

''دنیا میں سب سے باعزت مقام تیز رفتار گھوڑے کی زین ہے اور بہترین ہم نشین زمانے میں کتاب ہے''۔

د: (اخاء) اخ کی جمع:

کل اخائه کرام بنی الدنیا

''اس کے سب بھائی بند سب لوگوں سے زیادہ شریف ہیں''۔

۸۔عامیانہ پن: متنبی کے عیوب میں سے ایک عامیانہ پن بھی ہے۔(۳۴) مثلا:

ما انصف القوم ضبه وامه الطرطبه

''لوگوں نے ضبہ اور اس کی دراز اور ڈھیلی پستان والی ماں سے منصفانہ برتاؤ نہ کیا''۔

یہ پورا قصیدہ ایسا فحش ہے کہ خود متنبی کو بعد میں اس کا سننا گوارا نہ تھا۔اسی طرح:

فکانما حسب الاسنة حلوة او ظنها البرنی والازازا

''گویا اس نے نیزوں کو حلوہ سمجھا تھا یا اس کو برنی اور ازاز نامی کھجور سمجھا تھا (جو اس بے باکی سے مقابلہ پر

آمادہ ہوا تھا)''۔

شعراء عام طور پر قابل ستر مقامات کا تذکرہ ایسے الفاظ میں کرتے ہیں جو آداب مجلس کے خلاف نہ ہوں اور زبان پر لانے سے حیا دامن گیر نہ ہو لیکن متنبی نے اس باب میں تمام قیود وضوابط کو فراموش کردیا۔

۹۔استعارہ بعید: متنبی کا ایک عیب استعارہ بعیدہ ہے۔ چنانچہ سیف الدولہ کی ہمشیرہ کے مرثیہ میں لکھتا ہے:

لم یحک نائلک السحاب وانما حمت به فصبیبها الرحضاء

''بادل نے تیری بخشش کی نقل نہیں اتاری۔ بلکہ (مارے شرم کے) اس کو بخار چڑھا سو یہ بارش اس کے بخار کا پسینا ہے''۔

الا یشب فلقد شابت له کبد شیبا اذا خضبته سلوة نصلا

''اگر وہ عاشق بوڑھا نہیں ہوا تو اس کا جگر بے شک بوڑھا ہو گیا ہے۔ اگر اس پر ترک محبت کا خضاب کیا جائے تو وہ فوراً جاتا رہتا ہے اور وہی عشق کی بے چینی لوٹ آتی ہے''۔

ولقد دقت حلوائ البنین علی الصبا فلا تحسبنی قلت ما قلت عن جهل

''میں نے اولاد کی شیرینی ان کے عین زمانہ بچپن میں دیکھی ہے۔ سو یہ خیال نہ کر کہ میں نے جو کچھ کہا وہ نادانستگی سے کہا۔

مذکورہ بالا اشعار میں ایسے استعارے ہیں جن میں مناسبت کا دور کا کوئی رشتہ بھی نہیں پایا جاتا۔ حالانکہ استعارہ میں رونق اور حلاوت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب ایک خاص مشابہت اور مناسبت کی بناء پر استعارہ کیا گیا ہو۔

۱۰۔لفظ''ذا'' کا کثرت سے استعمال: متنبی لفظ''ذا'' کا استعمال بہت زیادہ کرتا ہے۔لفظ ''ذا'' کا شعر لانا شاعر کی کمزوری پر دال ہے۔(۳۵) اگر چہ لفظ''ذا'' کہیں کہیں مناسبت مقام کی رو سے کلام میں حسن بھی پیدا کر دیتا ہے۔ مگر اس طرح نہیں جیسا کہ متنبی اس کو بلاتحاشا استعمال کرتا ہے:

قد بلغت الذی اردت من البر ومن حق ذا الشریف علیکا

''تو نے ہمارے ساتھ جس احسان کا ارادہ کیا تھا اس کو پورا کر دیا اور نیز اس شریف کا حق بھی جو تجھ پر عائد

ہوتا تھا''۔

افی کل یوم ذا الدمستق مقدم قفاہ علی الاقدام للوجہ لائم

''کیا ہر روز یہ دمستق پیش قدمی کر کے تیری طرف آئے گا اور اس پیش قدمی پر اس کی پیٹھ کے منہ کو ملامت کرے گی (کہ کیوں اول اقدام کر کے اب پیٹھ پھیر لی)''۔

اس قسم کا استعمال متنبی کے کلام میں کثرت سے پایا جاتا ہے۔ حالانکہ اس کی سخافت اور ضعف بالکل ظاہر ہے۔ زمانۂ جاہلیت کے متعدد دواوین میں سے کوئی دیوان اٹھا لیجیے کہیں بھی آپ کو ''ذا'' کا استعمال نظر نہیں آئے گا۔ البتہ متاخرین شعرا نے اس کا استعمال کیا ہے لیکن بہت شاذ و نادر اور وہ بھی جہاں قافیہ تنگ ہو۔

۱۱۔ مبالغہ آمیزی کی انتہا: متنبی مبالغہ میں غلو کے اس درجہ تک پہنچ جاتا ہے جس کی قبولیت اور جواز کی کوئی صورت نہیں نکل سکتی۔ مثلاً:

فبعدہ والی ذا الیوم لو رکضت بالخیل فی لھوات الطفل ما سعلا

''سو اس دن سے آج تک یہ حال ہے کہ اگر ممدوح ان کے بچوں کے تالووں میں بھی گھوڑے دوڑائے تو وہ بھی (باوجود بے سمجھ ہونے کے) خوف کے مارے کھانس نہیں سکتے''۔

ولو قلم القیت فی شق راسہ من السقم ما غیرت من خط کاتب

''اور اگر میں کسی قلم کے شگاف میں ڈالا جاؤں تو لاغری کی وجہ سے لکھنے والے خط میں کسی قسم کا نقصان پیدا نہ کروں''۔

۱۲۔ تکرارِ لفظی: ایک لفظ کو بغیر کسی خاص صنعت کے ایک ہی شعر میں مکرر لاتا ہے۔ مثلا:

فقلقلت بالھم الذی قلقل الحشا قلاقل عیس کلھن قلاقل

''سو میں نے بہ سبب اس غم کے جس نے میرے اعضائے باطنی کو ہلا دیا۔ ایسی سریع السیر سانڈنیوں کو حرکت دی جو سب کی سب حرکات مجسم تھیں''۔

جواب مسائلی الہ نظیر ولا لک فی سوالک لا الا لا

''جو مجھ سے پوچھتا ہے کہ کیا ممدوح کا کوئی نظیر ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اس کی نظیر تو نہیں۔ لیکن تو بھی بے نظیر ہے''۔

پہلے شعر میں "قلقل" اور دوسرے شعر میں "لاالالا" کی تکرار پڑھنے اور سننے میں بڑی ثقیل معلوم ہوتی ہے۔

۱۳۔طریقہ خطاب میں لاپرواہی: متنبی آداب محفل اور طریق خطاب کی پرواہ نہ کرتے ہوئے بعض جگہ ایسے الفاظ لے آتا ہے جو شایان مجلس نہیں ہوتے۔مثلاً سیف الدولہ کی بہن کے مرثیہ میں کہتا ہے:

وھل سمعت سلاما لی الم بھا فقد اطلت وما سلمت عن کثب

ایعلمن حین تحی حسن مبسمھا ولیس یعلم الا اللہ بالشنب

"سلام لیتے وقت ان کے ہونٹوں کی خوبصورتی کو تو (ان کی سہیلیاں) معلوم کر لیتی ہیں اور ان کا آب دنداں سوائے خدا کے کوئی نہیں جانتا اور اے (زمین) کیا وہ سلام جو میری طرف سے اس کے پاس آیا تو نے سنا۔ کیونکہ میں نے اسے دور سے دعا بھیجی ہے اور قریب سے سلام کرنے کی نوبت نہیں پہنچی"۔

ابوبکر خوارزمی کہتا ہے کہ اگر میری زوجہ کے مرثیے میں کوئی شخص اس قسم کے الفاظ استعمال کرتا تو میں اس کو متوفیہ کے ساتھ ملا کر دم لیتا اور اس کی قبر پر شاعر کی گردن مار دیتا۔(۳۶)

۱۴۔عقائد فاسدہ کا اظہار: متنبی کے منجملہ عیوب کے ایک عیب عقائد فاسدہ کا اظہار بھی ہے۔اگر چہ ضعف عقیدہ کا فنی اعتبار سے شاعری سے کوئی تعلق نہیں مگر اسلام کی جلالت اور عظمت کا تقاضا یہ ہے کہ اپنے ہر قول و فعل میں (نثر ہو یا نظم) اس کا پورا پورا خیال رکھا جائے۔تاہم متنبی نے اس کا بالکل خیال نہیں رکھا۔مثلاً:

وابھر آیات التھامی انه ابوکم واحدی مالکم من مناقب

"بنی تہامیؐ کے معجزات میں سے روشن تر معجزہ یہ ہے کہ وہ تمہارے جیسی اولاد کا باپ (دادا) ہے اور تمہارے لیے ان کا باپ ہونا منجملہ دیگر مناقب کے ایک منقبت ہے"۔

تتقاصر الافھام عن ادراکه مثل الذی الافلاک فیه والدنا

"لوگوں کے فہم اس کے (مرتبے کے) دریافت سے ایسے قاصر ہیں جیسے اس چیز کے ادراک سے جس میں افلاک اور تمام عالم ہیں"۔

پہلے شعر میں نبی کریمؐ کی صریح توہین ہے۔جبکہ دوسرے شعر میں پورے افراط سے گستاخی

کی ہے کیونکہ افلاک اور دنیا کی حقیقت صرف علم الٰہی ہے اور متنبی نے اپنے ممدوح کو علم الٰہی کے مساوی کہا:

لو کان ذوالقرنین اعمل رایه　　لما اتی الظلمات صرن شموسا

''اگر ذوالقرنین جب کہ ظلمات میں گیا تھا۔ اس کی رائے کو کام میں لاتا تو ظلمات آفتاب کی طرح روشن ہوجاتے''۔

او کان صادف راس عازر سیفه　　فی یوم معرکة لاعیا عیسی

''یا اگر میدان کارزار میں عازر کا سر ممدوح کی تلوار سے لگتا۔ تو اس کا زندہ ہونا حضرت عیسیٰ کو عاجز کر دیتا (عازر کو حضرت عیسیٰ نے زندہ کر دیا تھا)''۔

او کان لج البحر مثل یمینه　　ما انشق حتی جاز فیه موسی

''یا اگر بحیرۂ قلزم کا وسط ممدوح کے داہنے ہاتھ کے عطیات کی طرح ہوتا تو وہ نہ پھٹتا کہ اس میں حضرت موسیٰ گذر جاتے''۔

معلوم ہوتا ہے کہ فقدان مضمون کے باعث متنبی کا قافیہ ایسا تنگ ہوا کہ توہین انبیاء کی نوبت آگئی۔(۳۷)

۱۵۔ بے تکی نسبت:　کبھی کبھی بالکل غلط مضمون بیان کرتا ہے اور بے تکی باتیں کہنے لگتا ہے۔ مثلاً:

اغار من الزجاجة وهی تجری　　علی شفة الامیر ابی الحسین

''میں شیشۂ شراب سے جبکہ وہ لب امیر ابوالحسین پر بہتا ہے غیرت اور رشک کرتا ہوں (کہ وہ کیوں فائز ہوا اور میں محروم رہا)''۔

حالانکہ میدانِ شعر میں یہ نسبت عاشق و معشوق کے درمیان ہوا کرتی ہے۔ جیسے ابوالفتح کشاجم نے اس مضمون کو نہایت شُستگی سے ادا کیا ہے:

اغار اذا دنت من فیه کأس　　علی در یقبله الزجاج

''جب اس کے منہ سے جام ملتا ہے تو میں اس موتی (دانت) پر رشک کرتا ہوں۔ جس کو گلاس چوم رہا ہے''۔

مگر امراء اور سلاطین کے دانتوں پر رشک کرنا بے معنی ہے۔

۱۶۔ فلسفیانہ موشگافیاں:　متنبی کبھی کبھی مسلک شعر کو خیر باد کہہ کر فلسفیانہ رنگ میں نمودار ہوتا

ہے۔مثلاً:

ولجدت حتی کدت تبخل حائلا للمنتھی ومن السرور بکاء

''تونے اتنی بخششیں کیں کہ انتہا تک پہنچ گیا۔اب قریب ہے کہ تورجوع کرکے بخیل ہوجائے۔کیونکہ غایت سرور سے گریہ آہی جاتا ہے''۔

الف ھذا الھواء اوقع فی الانفس ان الحمام مر المذاق

''زندگی کی محبت نے ان کے دلوں میں یہ مضمون ڈال دیا ہے کہ موت کا مزہ تلخ ہے''۔

۱۷۔مقطع کی بے رونقی: قادرالکلام شاعر قصیدے کو اس طرح ختم کرتا ہے کہ طبیعت پیاسی رہتی ہے اور شوق کم نہیں ہوتا۔متنبی بعض اوقات اس کے بھی خلاف کر جاتا ہے جو صنعت شعر میں عیب ہے۔(۳۸) اس قصیدہ کا مقطع دیکھیے جو بالکل بے رونق ہے:

لو لم تکن من ذاالوری اللذ منک ھو عقمت بمولد نسلھا حواء

''اگر تو منجملہ اس مخلوق کے جو درحقیقت تجھ سے ہے نہ ہوتا تو حضرت حواء اپنی نسل کے پیدائش سے بانجھ ہوتی''۔

پھر''ذا''اور''اللذا''کے اجتماع سے طبیعت پر جو اثر پڑتا ہے اس کو ایک باذوق خوب سمجھ سکتا ہے۔ایک دوسرے قصیدہ کا مقطع ہے:

خلت البلاد من الغزالۃ لیلھا فاعاضھاک اللہ کی لا تحزنا

''شہر رات کے وقت آفتاب سے خالی تھے تو اس کے عوض خدائے تعالیٰ نے ان شہروں کو بخشا تا کہ تجھے غم نہ ہو''۔

خلاصہ بحث یہ کہ عربی نظم میں تصرفات لفظی،حسن اداء اور نازک خیالی کے جو نقوش متنبی نے چھوڑے ہیں اس کے اثرات بعد کے شعراء کے کلام میں واضح طور پر محسوس کیے جاسکتے ہیں۔اگر یوں کہا جائے کہ متنبی نے عربی نظم کی قدیم روایات کو مکمل طور پر اخذ کرکے اسے جدت طرازی کے کئی نئے اسالیب سے روشناس کرایا تو شاید غلط نہ ہوگا۔لیکن نظم عربی میں تجدیدی روایت کو فروغ دینے کے عمل میں اس کے تسامح اور اغلاط سے بھی صرف نظر نہیں کیا جاسکتا۔متنبی کے کلام کا مطالعہ کرتے وقت اس کے حسن بیان کے کیف وسرور میں سر دھننے والا اس وقت سخت حیرت میں مبتلا ہوجاتا ہے جب وہ ایک دم کوئی ایسی رکیک اور بے تکی بات کہہ جاتا ہے جس کی توقع کسی کو نہیں ہوتی۔عدم تسلسل

اور بے ربطی کے اس طرز عمل کی ایک وجہ شاید اس کے حالات کی بے ترتیبی اور بے قراری بھی تھی کیونکہ اس نے تمام زندگی ایک خانہ بدوش اور آوارہ گرد کی حیثیت سے گزاری۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے کلام میں جہاں اہم ادبی نمونے موجود ہیں وہیں سوقیانہ خیالات کی بھی کئی مثالیں موجود ہیں۔ متنبی کو تمام زندگی یہ شکوہ رہا کہ زمانہ نے اس کی قدر نہیں کی اور اس کا اظہار اس نے اپنے کلام میں بھی جا بجا کیا ہے۔ تاہم زمانے کی ستم ظریفی کا گلہ صرف متنبی ہی نہیں بلکہ ہر دور کے اہل فن کو رہا ہے۔ لیکن ہماری ناقص رائے میں متنبی جس مقام و مرتبہ کے حصول کے لیے تمام زندگی سرگرداں رہا وہ اقتدار اور امارت کی خواہش تھی ورنہ اس کے فن کی قدردانی تو خود اس کے زمانے ہی میں ہو چکی تھی۔ متنبی نے اقتدار کے حصول کے لیے اپنے مزاج کے برخلاف امراء و سلاطین کی جھوٹی قصیدہ گوئی سے لے کر ریاستی بغاوت تک کا ہر حربہ اختیار کیا۔ یقیناً متنبی کے اس طرز عمل سے اختلاف کی مکمل گنجائش موجود ہے لیکن عربی ادب سے شغف رکھنے والے اہل علم کو یہ گلہ ہمیشہ رہے گا کہ متنبی اگر اقتدار کی طلب میں اپنی توانائیاں صرف نہ کرتا تو شاید عربی زبان و ادب میں جدت طرازی کے کئی اور اہم پہلو اور زاویے ہمارے سامنے ہوتے۔

حوالہ جات

(۲۴) الثعالبی، عبدالملک ابومنصور، یتیمة الدھر فی محاسن اھل العصر، ج ۳، ص ۸۰۔ (۲۵) الدمشقی، یوسف البدیعی، الصبح المنبی عن حیثیة المتنبی، ج ۱، ص ۱۹۔ (۲۶) ابن الاثیر، ضیاء الدین، المثل الثائر فی ادب الکاتب و الشاعر، ج ۳، ۳۶۴۔ (۲۷) مرجع سابق، ج ۳، ص ۳۰۷۔ (۲۸) الیازجی، ناصیف بن عبداللہ، العرف الطیب فی شرح دیوان ابی الطیب، ص ۴۶۹۔ (۲۹) الدمشقی، یوسف البدیعی، الصبح المنبی عن حیثیة المتنبی، ج ۱، ص ۲۶۵۔ (۳۰) الثعالبی، عبدالملک ابومنصور، یتیمة الدھر فی محاسن اھل العصر، ج ۳، ص ۲۷۸۔ (۳۱) سورۃ بنی اسرائیل، آیت نمبر ۶۷۔ (۳۲) الواحدی، ابوالحسن احمد بن محمد بن علی، شرح دیوان المتنبی، ص ۳۴۳۔ (۳۳) الیازجی، ناصیف بن عبداللہ، العرف الطیب فی شرح دیوان ابی الطیب، ص ۲۲۱۔ (۳۴) الثعالبی، عبدالملک ابومنصور، یتیمة الدھر فی محاسن اھل العصر، ج ۳، ص ۸۱۔ (۳۵) ابن الاثیر، ضیاء الدین، المثل الثائر فی ادب الکاتب و الشاعر، ج ۲، ۱۷۴۔ (۳۶) مرجع سابق، ج ۲، ص ۱۹۸۔ (۳۷) العکبری، ابوالبقاء، التبیان فی شرح الدیوان، ج ۲، ص ۱۴۲۔ (۳۸) الثعالبی، عبدالملک ابومنصور، یتیمة الدھر فی محاسن اھل العصر، ج ۳، ص ۱۶۷۔

ریاست جموں وکشمیر میں اردو زبان مسائل اورامکانات

ڈاکٹر فردوس نذیر

ریاست جموں وکشمیر میں اردوزبان کی تاریخ: ریاست جموں وکشمیر میں اردوزبان کی داغ بیل کب پڑی اس بات کا تعین کرنا قدرے دشوار ہے، کیونکہ یہ سینکڑوں برس پر محیط ایک غیر محسوس ارتقاء کا نتیجہ ہے، تاہم یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ کشمیر کی بہ نسبت جموں میں اس کی تخم پاشی پہلے ہوئی ہے کیونکہ برصغیر کی تقسیم سے قبل پنجاب کے ساتھ اس خطے کے روابط کا ثبوت ملتا ہے، تاریخی کتب اس بات کی غمازی کرتی ہیں کہ جموں وکشمیر میں اردو کی نشوونما ڈوگرہ دور میں ہوئی ہے، ڈوگرہ عہد سے پہلے اس خطے پر سکھ حکمرانوں کا تسلط تھا، اس دور میں یہاں فارسی زبان کا رواج تھا اور یہ یہاں کی سرکاری زبان کے منصب پر فائز تھی، جموں میں ڈوگری عام بول چال کی زبان تھی جبکہ کشمیر میں کشمیری زبان کا سکہ چلتا تھا، ڈوگرہ حکام نے ابتداء میں اگرچہ ڈوگری کو دفتری زبان کا درجہ دینے کی کوشش کی مگر وہ اس کوشش میں کامیاب نہ ہوسکے، کیونکہ ڈوگری میں وہ اہلیت نہ تھی کہ وہ اس کثیر اللسان خطے کی مرکزی زبان اور دفتری مواصلت کا ذریعہ بن سکے، اردو چونکہ اس پورے خطے میں پہلے ہی اپنی طنابیں مستحکم کرچکی تھی لہٰذا اسی زبان کو یہ دستار فضیلت حاصل ہوگئی، اردو کے مشہور ادیب اور مورخ شاد فرید آبادی رقم طراز ہیں:

> ”مہاراجہ گلاب سنگھ نے فارسی کو دفتری زبان قرار دیا مگر سرکاری سطح پر اردو کو بھی فروغ ملتا رہا، انیسویں صدی کے نصف تک ریاست کے مرکزی دفتروں کو چھوڑ کر باقی تمام سرکاری کام اردو میں ہونے لگے، ۱۸۲۰ء میں راجہ محمد تیغ سنگھ

لیکچرر گورنمنٹ ڈگری کالج ترال پلوامہ، کشمیر۔

کی غیر مشروط تخت سے دست برداری سے کشتواڑ، ڈوڈہ اور بانہال گلاب سنگھ کے زیر نگین آ گیا، ۱۸۴۶ء میں بھدرواہ کی تسخیر کے بعد سارا علاقہ ڈوگرہ قلمرو میں شامل ہو گیا۔ ڈوگرہ حکمرانوں نے ابتداء میں ڈوگری کو سرکاری اور غیر سرکاری سطح پر مقبول بنانے کی سعی کی مگر اس کا اثر تجارتی لین دین اور مہاجنوں کے ہی کھاتوں تک محدود رہا، عوام نے ذہنی طور پر اسے قبول نہ کیا، نتیجہ یہ نکلا کہ ڈوگری دفتری زبان نہ بن سکی، مجبوراً اردو کو سرکاری زبان کے طور پر تسلیم کیا گیا، دفتری زبان بننے سے اردو کی افادیت اور اہمیت بڑھ گئی''۔(۱)

یہ بات قابل ذکر ہے کہ مہاراجہ گلاب سنگھ جو کہ ڈوگرہ سلطنت کا پہلا حکمراں تھا اس نے برطانوی مفادات کے مدنظر ۱۶/ مارچ ۱۸۵۶ء کو عہد نامہ امرتسر کی رو سے کشمیر کو نانک شاہی ۷۵ لاکھ مالیت کے عوض خریدا، بہت جلد دہلی اور لاہور کے ساتھ ریاست کے سرکاری روابط عمل میں آئے اور ان کے درمیان باہمی تجارت اور مواصلت کا سلسلہ شروع ہو گیا، چنانچہ بیرون ریاست کے لوگ سیر و سیاحت کی غرض سے کشمیر آنے لگے اور ریاست کے عوام تجارت کی غرض سے باہر جانے لگے، اردو چونکہ دہلی اور لاہور کے اندر پہلے ہی مقبولیت حاصل کر کے وہاں خیمہ زن ہو چکی تھی لہٰذا اس باہمی میل جول نے فطری طور پر ریاست میں اردو زبان کو تقویت عطا کی، دریں اثناء ڈوگرہ حکام کو یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ ان کے دربار میں ایسے نقیبوں کو متعین کیا جائے جو دہلی اور لکھنو کے نوابوں کی طرح آداب شاہی بجالانے کا سلیقہ رکھتے ہوں، چنانچہ ایسے نقیبوں کو ریاست میں طلب کیا گیا جو ٹکسالی اردو بولتے تھے، چنانچہ اس چیز نے براہ راست اردو زبان کو مقبولیت دینے میں اپنا کردار نبھایا۔(۲)

مہاراجہ گلاب سنگھ کے بعد مہاراجہ رنبیر سنگھ (۱۸۷۵-۱۸۸۵ء) ریاست پر قابض ہوا، وہ علم و ادب کا دلدادہ اور اہل علم کا قدردان تھا، اس نے علوم و فنون کو مقبولیت بخشنے کے لیے وقت کے فاضل ادباء اور اہل علم کی خدمات حاصل کی، ان میں دیوان کرپارام کا نام قابل ذکر ہے جو مہاراجہ کا وزیر اعظم تھا اور فارسی کی کئی کتابوں کا مصنف ہونے کے علاوہ اردو زبان پر گہری دسترس رکھتا تھا، مہاراجہ کے دربار کا یہی وہ پہلا شخص ہے جس نے اپنے علم و ہنر اور ذہانت کی بنیاد پر ریاست کی انتظامی صورت حال کا تحریری خاکہ بزبان اردو تیار کیا، اہل علم اس تحریر کو ریاست میں اردو کا نقش

اول قرار دیتے ہیں، یہ مہاراجہ رنبیر سنگھ ہی تھا جس نے ریاست میں علم وادب کی اعلی پیمانے پر ترویج واشاعت کے لیے جموں کے مقام پر سنسکرت کالج کی بنیاد رکھی، اس کے علاوہ سنسکرت اور فارسی کتب کو اردو میں منتقل کرنے کے لیے ایک دارالترجمہ کا قیام عمل میں لایا، عبدالقادر سروری کے مطابق رنبیر سنگھ کے عہد میں اردو کی علمی، ادبی اور افادی اہمیت کے مدنظر اسے ذریعہ تعلیم اور ادبی اظہار کا وسیع موقف حاصل ہو چکا تھا اور یہ دفتروں، عدالتوں اور دربار کی زبان بن چکی تھی، اس زمانے میں کشمیری ادباء کا بیرون ریاست کے ادیبوں سے روابط میں بھی اضافہ پیدا ہوا اور بعض چوٹی کے ادباء کشمیر آنے جانے لگے (۳)، مہاراجہ کا سب سے عظیم کارنامہ ”وکرم بلاس“ اور پھر ”بدیا بلاس پریس“ کا قیام ہے جس کو اردو زبان کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے مہاراجہ نے ۱۸۸۲ء میں قائم کیا اور اس کے ذریعہ اردو زبان کو ریاست میں پنپنے، پھلنے پھولنے اور پھیلنے کی ایک محکم اساس فراہم کی، ۱۸۸۲ء کے اندر ہی ریاست کا پہلا اخبار ”بدیا بلاس“ سرکاری گزٹ کے طور پر منظر عام پر آیا جو اردو اور ہندی رسم الخط میں شائع کیا گیا، مہاراجہ نے علاوہ ازیں ٹیلی گرام کے لیے اردو الفاظ کے استعمال کا حکم صادر کیا اور اس طرح اردو الفاظ کو ٹیلی گرام کی شناختی علامت بنایا جو اردو زبان کے ساتھ اس کی گہری وابستگی سے عبارت ہے، الغرض مہاراجہ نے ریاست میں اردو زبان کو ترقی دینے میں جو خدمات انجام دیں وہ بلاشبہ قابل ستائش اور تاریخ کے اوراق پر ثبت کرنے کے لائق ہیں۔

مہاراجہ رنبیر سنگھ کے بعد مہاراجہ پرتاب سنگھ نے ۱۸۸۵ء میں ریاست کی زمام اقتدار سنبھالی، اس نے اردو زبان کو دفتری اور تعلیمی اداروں میں رائج کیا جس کے نتیجہ میں عوام الناس کی بڑی تعداد اردو لکھنے اور پڑھنے کی طرف مائل ہوگئی، مہاراجہ نے اردو کی اہمیت وافادیت کو دیکھتے ہوئے ریاست میں پنجاب یونیورسٹی کا نصاب لاگو کیا جس میں اردو کو لازمی مضمون قرار دیا گیا، مہاراجہ نے ریاست کے تینوں خطوں، جموں وکشمیر اور لداخ کو ایک ہی لسانی دائرے میں ہم آہنگ اور مربوط کرنے کے لیے ۱۸۸۹ء میں اردو کو سرکاری زبان کا درجہ عطا کیا، اردو زبان کے تئیں مہاراجہ کا یہ وہ عظیم کارنامہ ہے جس نے ریاست میں اردو زبان کی حیثیت کو دوبالا کیا اور یہ اجتماعی، تعلیمی، علمی اور ادبی سرگرمیوں کے ساتھ لازم وملزوم ہوگئی، مہاراجہ کی اس علم دوستی کا نتیجہ تھا کہ اس دور میں سالگرام سالک جیسے اہل زبان اور دانشور پیدا ہوئے جنھوں نے اردو زبان کے تئیں ناقابل

فراموش خدمات انجام دیں، سالگرام سالک اردو کے بہت بڑے شیدائی تھے وہ ایک طویل مدت تک ''اودھ اخبار'' میں اپنے مقالات اور مضامین شائع کرتے رہے اور بعدازاں ''خیرخواہ کشمیر'' کے نام سے ایک مستقل ہفت روزہ اخبار کا اجراء کر کے اسے اپنے افکار ونظریات کا آئینہ دار بنایا، اس کے علاوہ مہاراجہ کی ایماء پر ''قانونی تعزیرات جموں وکشمیر'' کی مبسوط شرح ''ضابطہ دیوانی'' کو اردو میں حوالہ قرطاس کرنے کا ایک نہایت اہم فریضہ انجام دیا، وہ ایک بلند پایہ ادیب اور قلم کار بھی تھے، ان کی ادبی تصانیف میں ''لغات اردو''، ''محاورات اردو''، ''گنجینہ فطرت''، ''تحفہ سالک'' وغیرہ جیسی نایاب کتب شامل ہیں۔

ریاست میں اردو زبان کو انتظامی اور سرکاری زبان کا درجہ ملنے سے اس کی اہمیت میں غیر معمولی اضافہ ہوا، اردو زبان کی تعلیم و تعلم کا رواج پڑا اور اس کی بڑے پیمانے پر آبیاری ہوئی، ریاست میں اردو زبان کو پنپنے اور ترقی کرنے کے امکانات بڑھ گئے یہاں تک کہ یہ ہر خاص و عام کی منظور نظر بن گئی، ڈاکٹر مشتاق احمد وانی اس عظیم تبدیلی اور اس کے دوررس اثرات کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''اردو زبان کو ریاست میں سرکاری زبان کا درجہ دیا گیا تو شعروادب کے لیے فضا سازگار ہوئی اور ریاست کے کئی ادیبوں اور شاعروں نے اپنے جذبات واحساسات کے اظہار کا وسیلہ اردو کو بنایا، ان کی تخلیقات اخباروں کے ادبی ایڈیشنوں کی زینت بننے لگیں۔ اردو نے یہاں نہ صرف تخلیقی زبان کا شرف حاصل کیا بلکہ یہ ریاست کے تین صوبوں میں رابطے کی زبان کا مرتبہ بھی حاصل کر گئی، سرکاری دفاتر، اسکولوں، کالجوں، عدالتوں میں اردو رائج ہوگئی اور اسکولوں کالجوں میں پڑھائی جاتی رہی، کلچرل اکادمی ریاستی زبانوں اور تہذیب وثقافت کو فروغ دینے کے لیے قائم کی گئی، ٹیلی ویژن، ریڈیو اور محکمہ اطلاعات ونشریات کے زیر اہتمام اردو ادب کی مقبولیت میں خاصا اضافہ ہوا، ان تمام حالات میں جہاں ادبی اصناف کی ترقی کے تابناک امکانات پیدا ہوئے وہیں شعراء کی ایک کثیر تعداد سامنے آئی''۔ (۴)

انیسویں صدی کا دور اردو زبان کی تاریخ کا اہم دور ہے، اس دور میں اردو صحافت کا باقاعدہ آغاز ہوا اور یہ سیاسی، سماجی، تعلیمی اور معاشی مسائل کی ترجمانی کا ذریعہ بن گئی، جن لوگوں نے اردو صحافت کے چمن کو سینچا، ان میں محمد الدین فوق، لالہ ملک راج صراف اور پریم ناتھ بزاز کے نام قابل ذکر ہیں، محمد الدین فوق نے جہاں تاریخ اور تذکرہ نویسی کے میدان میں طبع آزمائی کی وہیں صحافت کے میدان میں اپنے افکار و نظریات کے جوہر بکھیرے، لالہ ملک راج صراف ریاست میں صحافت کے اولین نقیب شمار ہوتے ہیں جنھوں نے ۱۹۲۴ء میں ''رنبیر'' کے نام سے ایک اخبار جاری کیا اور اس کے ذریعہ اردو نثر کو ترقی دینے کا نہایت اہم کارنامہ انجام دیا، جہاں تک پریم ناتھ بزاز کا تعلق ہے انھوں نے ۱۹۳۳ء میں ''وتستا'' کے نام سے سری نگر کا پہلا خبر نامہ منظر عام پر لایا، اس کے علاوہ شیخ محمد عبد اللہ کی شراکت سے ہفت روزہ ''ہمدرد'' کا اجراء کیا، ان اخبارات نے اردو زبان کے شائقین کو اظہار خیال کا ایک وسیع پلیٹ فارم مہیا کیا اور انہیں سماجی مسائل کی نمایندگی کا ذریعہ بنایا، اس طرح اردو نثر نگاروں کی ایک نئی پود سامنے آئی جن میں مولوی زین العابدین، مولوی عبد اللہ وکیل، عشرت کشتواڑی، غلام حیدر چشتی، قیس شیروانی، سالگرام کول، پریم ناتھ رونق، بلدیو پرشاد شرما جیسی شخصیات شامل ہیں۔(۵)

ذرائع ابلاغ کے میدان میں بھی اردو کو نمایاں اور بلند مقام حاصل ہوگیا، اردو کو ریاست کے اندر دور ترسیلیت کی موثر ایجاد شدہ زبان ہونے کا شرف ملا اور یہ اس خطے میں مواصلاتی نظام کا جز لاینفک بن گئی، خصوصاً دور جدید میں جبکہ اردو اپنی وسعت اور گونا گونیت کی بدولت پرنٹ میڈیا اور الکٹرانک میڈیا کے ساتھ ضم ہوکر ریاست میں اردو زبان و ادب، تہذیب و ثقافت کی ترویج کا وسیلہ بن چکی ہے۔

بیسویں صدی میں اردو زبان کی ہمہ جہت ترقی کے دور کے نصف اول میں میر غلام رسول نازکی، شہزور کاشمیری، تنہا انصاری، طالب کاشمیری اور رسا جاودانی جیسے شعراء ابھر کر سامنے آئے جبکہ فن نثر میں اکبر حیدری، غلام نبی خیال، فاروق نازکی، محمد زمان آزردہ اور فرید پربتی جیسے ادباء نے شہرت حاصل کی (۶)، حامدی کاشمیری کا نام غزل گوئی میں سرفہرست ہے جنھوں نے اردو غزل کو جولانی بخشی، حامدی کے علاوہ جن شعراء نے ریاست میں اردو شاعری میں نئے گل بوٹے کھلائے

ان میں عرش صہبائی، ہمدم کاشمیری اور فاروق ناز کی جیسے ارباب سخن قابل ذکر ہیں (۷)، شعر ونثر کے ساتھ ساتھ ناول، ڈرامہ، افسانہ اور تنقید نگاری کے فن کو فروغ ملا اور اس کی حوصلہ افزائی ہوئی، ریاست میں ناول نگاری کی داغ بیل بیسویں صدی کے آغاز سے محمد الدین فوق اور پنڈت سالگرام جیسی شخصیات کے ہاتھوں پڑی، محمد الدین فوق کے دو تاریخ انگیز ناولیں ''اکبر'' اور ''انار کلی'' فن ناول کی وہ ابتدائی کاوشیں ہیں جو اس صنف ادب کا پیش خیمہ ثابت ہوئی، اگرچہ فنی اعتبار سے یہ ناولیں غیر پختہ اور ناقص معلوم ہوتی ہے تاہم یہ اس میدان میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں، اس دور کے عظیم ناول نگاروں میں رامانند ساگر اور پریم ناتھ پردیسی کے نام قابل ذکر ہیں، رامانند ساگر کے ناول ''اور انسان مر گیا'' کو ادبی حلقوں میں کافی مقبولیت اور پذیرائی حاصل ہوگئی۔

افسانہ نگاری میں سب سے پہلے محمد الدین فوق نے توجہ دلائی، انہوں نے مختلف تاریخی قصص اور واقعات کو ضبط تحریر میں لاکر انہیں منظر عام پر پیش کیا، یہ ریاست میں اس فن کے اولین نمونے شمار کیے جاسکتے ہیں، اس کے بعد پریم ناتھ سادھو اور پریم ناتھ در جیسے فنکار آئے۔ پریم ناتھ سادھو کا ''دنیا ہماری''، ''شام وسحر'' اور ''بہتے چراغ'' اور پریم ناتھ در کا افسانوی مجموعے ''کاغذ کا واسدیو'' اور ''نیلی آنکھیں'' قابل ذکر ہیں، ان کے علاوہ چراغ حسن حسرت، قدرت اللہ شہاب، نرسنگھ داس وغیرہ جیسے ناول نگاروں نے اس فن پر قلم اٹھایا۔

تنقید نگاری میں عبدالاحد آزاد کی معرکۃ الآراء تصنیف ''کشمیری زبان اور شاعری'' قابل ذکر ہے۔ محمد الدین فوق کی تنقیدی نگارشات میں ''یاد رفتگاں''، ''تذکرہ علمائے اردو'' اور ''تذکرہ شعرائے لاہور'' کا ذکر اہم ہے۔(۸)

اردو زبان کو فروغ دینے میں مذہبی و اصلاحی و ادبی تنظیموں کا بھی نمایاں کردار ہے، سوامی دیانند کی تحریک آریہ سماج، انجمن نصرت الاسلام، انجمن معین الاسلام کی سرگرمیوں کے نتیجہ میں اردو نے تاریخ ساز کردار نبھایا ہے۔(۹)

ریاست میں اردو زبان کے مسائل و امکانات مسائل: اردو زبان جیسا کہ سابقہ صفحات میں رقم ہوا ہے ریاست جموں وکشمیر کی نمایندہ زبان ہے، سرکاری زبان کے ساتھ ساتھ یہ ریاست کی مشترکہ تہذیب کی علامت شمار ہوتی ہے، تاہم اس کے باوجود اردو زبان کو اس دور میں کئی مسائل کا

سامنا ہے، پوری دنیا میں جہاں مغرب کے ثقافتی اور لسانی یلغار کے نتیجہ میں انگریزی زبان و تہذیب کو فروغ مل رہا ہے وہیں ریاست جموں و کشمیر میں بھی یہ اردو زبان و ثقافت کی جگہ لے کر اسے جڑ سے کھوکھلا کر رہی ہے، دیپک بدکی کے الفاظ میں اردو کو آج جس چیلنج کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے اس سے پہلے ایسی حالت کبھی نہ تھی، عالمی سطح پر انگریزی اکٹوپس کے پھیلتے پنجے، انٹرنٹ پر انگریزی کا چلن، مغرب کی ثقافتی جارحیت، سائنس اور ٹیکنالوجی میں انگریزی زبان کی بالادستی، ہندی اور اردو کی باہمی مسابقت، سیاسی منافرت اور مقامی ادباء کی علاقائی عصبیت یہ وہ چیزیں ہیں جنھوں نے آزادی کے بعد اردو زبان کو بے انتہا زک پہنچائی ہے اور ایسے ماحول کے اندر اس شیریں زبان کا دم گھٹتا چلا جا رہا ہے۔(۱۰)

یہ بھی سچائی ہے کہ اردو زبان بتدریج حکام کی بے التفاتی اور لاپرواہی کا شکار ہو رہی ہے، بیوروکریسی اور سکریٹریٹ کی سطح پر سارا کام انگریزی زبان میں ہوتا ہے، انتظامیہ کے بنیادی ڈھانچے میں ۹۵ فیصد حکام ایسے ہیں جو انگریزی اور ہندی کی واقفیت تو رکھتے ہیں مگر اردو زبان سے بڑی حد تک ناآشنا ہیں، محکمہ پولیس، محکمہ مال اور عدلیہ میں نچلی سطح پر اردو میں کام تو ہو رہا ہے مگر اعلیٰ سطح پر انگریزی زبان کا ہی ہر جگہ تسلط ملتا ہے، جہاں تک تعلیمی اداروں کا تعلق ہے تو یہاں بھی اردو بتدریج عنقا ہو رہی ہے، گزشتہ دو دہائیوں سے قبل ریاضیات جیسے مشکل مضامین بھی اردو میں پڑھائے جاتے تھے، سوشل اسٹڈیز کی تدریس دسویں جماعت تک اردو میڈیم میں ہوتی تھی مگر اب حال یہ ہے کہ نصاب میں اردو زبان بحیثیت مضمون سکڑتا ہوا نظر آ رہا ہے۔

تعلیم یافتہ نسل کی توجہ اب انگریزی زبان اور انگریزی علوم کی طرف ہو رہی ہے، تعلیمی اداروں میں انگریزی کے بجائے اردو میں گفتگو کرنا باعث عار محسوس ہوتا ہے۔ اردو کے ساتھ روزگار کے مسائل بھی کافی حد تک جڑے ہیں، حالت یہ ہے کہ ہمارے بہت سے نوجوان اردو سے گہرا شغف رکھنے کے باوجود اردو کا انتخاب اس لیے نہیں کرتے کیونکہ اس میں انھیں روشن مستقبل کی کوئی سبیل نظر نہیں آتی۔

اردو صحافت بھی ضعف و اضمحلال کا شکار ہو رہی ہے، ریاست میں اب اردو کی جگہ انگریزی اخبارات قارئین کی توجہ کا مرکز بن رہے ہیں۔

موجودہ دور میں اردو زبان کی ترویج وترقی کے لیے جو تحریکیں اور جماعتیں سرگرم عمل ہیں وہ بھی اردو زبان کو کسی بڑے پیمانہ پر رواج دینے اور اس کی عظمت رفتہ کو بحال کرنے میں ناکام ثابت ہوئی ہیں، جموں وکشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لنگویجز اس سلسلہ کی ایک اہم کڑی ہے، یہ ادارہ اگرچہ اردو زبان کی ترویج وترقی کے لیے کوشاں ہے تاہم اس کا دائرۂ عمل بھی مشاعروں کے انعقاد اور کتابوں کی رسم اجراء تک محدود ہو کے رہ گیا ہے، اس نوعیت کے دیگر ادارے مالی بحران کا شکار ہیں، مالی ذرائع کی قلت ان کے جمود وانحطاط کا ایک اہم سبب ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ حکومت کی سرپرستی میں ان تمام اداروں کی از سر نو تجدید کر کے انھیں فعال، متحرک اور عصر حاضر کے تقاضوں سے ہم آہنگ کیا جائے۔(۱۱)

اردو زبان کی ترویج واشاعت میں حائل ایک بڑی دشواری تعلیمی بورڈ میں اس کا عدم تحفظ ہے، اردو کو آئینی اولیت کا تحفظ حاصل نہ ہونے کی وجہ سے انگریزی زبان اس کی جگہ اولیت کے مقام پر مسلط ہو چکی ہے، اردو نہ نصاب تعلیم میں تحفظاتی ضمانت کی حامل ہے اور نہ یہ واحد لازم تحصیل زبان کے درجہ پر فائز ہے، سرکاری ملازمتوں میں اردو کی تعلیم نہ مشروط ہے اور نہ اسے باقی علاقائی زبانوں پر کوئی تفوق حاصل ہے، اردو زبان کے ساتھ حکومت کی اس بے التفاتی کے نتیجہ میں اردو کا دائرۂ عمل سمٹ رہا ہے اور اس کی حیثیت بھی بتدریج زائل ہو رہی ہے۔ ضرورت اس چیز کی ہے کہ اردو کو نہ صرف تعلیمی، سیاسی اور انتظامی سطح پر بلکہ زندگی کے جملہ شعبہ جات میں وہ مقام دیا جائے جس کی یہ بجا طور پر مستحق ہے۔

امکانات: موجودہ دور میں جبکہ اردو زبان کو ہر محاذ پر مسائل اور دشواریوں کا سامنا ہے، سرکاری سطح پر اس کی حوصلہ شکنی اور تعلیمی اداروں میں اس کی بساط لپٹتی ہوئی نظر آرہی ہے وہیں ان نامساعد حالات میں ایسے امکانات کی نوید سنائی دیتی ہے جن کو روبہ عمل لاکر اردو زبان کے دیرینہ سرچشمہ کی حفاظت اور اس کی عظمت رفتہ کو بحال کیا جاسکتا ہے، ذیل میں کچھ ضروری تجویزیں حوالہ قرطاس ہیں:

۱۔ اردو کو آئین میں دسویں جماعت تک لازمی مضمون کی حیثیت دی جائے تاکہ تعلیمی اداروں میں اردو پڑھنے والے طلبہ کی تعداد میں اضافہ ہو اور اس کی بدولت اردو میں روزگار کے

مواقع پیدا ہوسکیں۔

۲۔ریاستی انتظامیہ ریاستی آئین کے تحت اردو زبان کی اولیت کو تسلیم کر کے تمام دفاتری کارروائی کو اردو میں براہ راست منتقل کرے۔

۳۔ریاست میں ایک اردو اکاڈمی برائے فروغ اردو زبان کا قیام عمل میں لایا جائے جس سے اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوانوں کو روزگار مل سکے اور ریاست کے مختلف اضلاع میں اس کی شاخیں قائم کی جائے۔

۴۔حکومتی سطح پر سرکاری دفاتر ، بازاروں ، پارکوں، عوامی اجتماعات کے مقامات پر انگریزی کے علاوہ اردو میں سائن بورڈ نصب کیے جائے۔

۵۔اردو اساتذہ کے لیے تربیتی ورکشاپ کا اہتمام کیا جائے جن میں انھیں تعلیمی مقاصد کے لیے ملٹی میڈیا، پروجیکٹر اور سمعی وبصری آلات کے استعمال کی عملی تربیت دی جائے۔

۶۔اردو اساتذہ کے لیے خوش خطی اور خوش نویسی کی مسلسل تربیت کا بندوبست کیا جانا چاہیے، یہ بات قابل ذکر ہے کہ ریاستی کلچرل اکادمی نے چند برس قبل ایک خوش نویسی کا ادارہ شروع کیا ہے جہاں کاتبوں کو خوش نویسی کی تربیت دی جاتی ہے،اس ادارے کو مزید فعال اور متحرک بنانے کی ضرورت ہے۔

۷۔ریاست میں ایک دارالترجمہ کی تاسیس عمل میں لائی جائے جہاں مختلف زبانوں میں علوم وفنون کی کتابیں اردو میں منتقل کی جاسکے۔اردو زبان کے بہت سے شائقین طب، کامرس، انجینئرنگ وغیرہ جیسے پیشہ ورانہ کورسز کو اردو میں براہ راست پڑھنے کے خواہش مند ہوتے ہیں ان کورسز کے لیے ہمارے ہاں اردو کے ذریعہ تعلیم دینے کا کوئی معقول انتظام نہیں ہے اور نہ اردو میں ترجمہ کی کتابیں دستیاب ہیں، دارالترجمہ ایک ایسا پلیٹ فارم بن سکتا ہے جس کی وساطت سے اس خواب کو بڑی حد تک شرمندہ تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

۸۔ریاست سے ایک ایسا معیاری اور دیدہ زیب ماہنامہ شائع ہونا چاہیے جو اردو زبان کے لیل ونہار کا آئینہ دار ہو،اردو اکادمی کی طرف ''اکادمی'' کے نام سے اس نوعیت کا ایک خبرنامہ شائع ہوتا رہا ہے جسے باقاعدہ خبرنامہ بنا کر دوبارہ منظر عام پر لانے کی ضرورت ہے۔

۹۔اردو زبان کی آبیاری کرنے والے اہل علم اور قلم کاروں کی حوصلہ افزائی کی جانی چاہیے تاکہ وہ اردو زبان سے شغف رکھنے والوں کے لیے محرک ثابت ہوں، جو لوگ اپنی ادبی تخلیقات اور فنی نگارشات کو مالی مسائل کے سبب شائع کرنے سے قاصر ہوں انھیں یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کی طرف سے مالی مدد حاصل ہونی چاہیے۔

۱۰۔انتظامی سطح پر اردو کے تحفظ کو یقینی بنایا جائے، ریاستی ملازمتوں میں بھی اس کی شرط اولین قرار دی جائے اور اردو داں امیدواروں کو ترجیحی بنیادوں پر بھرتی کیا جائے۔

۱۱۔ریاست گیر سطح پر اردو زبان کی ترویج واشاعت کے لیے ایک اردو عملہ مقرر کیا جائے۔

۱۲۔ریاست کے مختلف محکمہ جات میں اردو زبان کے اندر درخواستیں لینے اور اردو میں جواب دینے کی لازمی شرط طے کی جائے، تعلیمی شعبوں میں بھی اس عمل کو یقینی بنایا جائے۔

۱۳۔اردو زبان کی اہمیت وافادیت، اس کی عصری معنویت اور اس کے سرچشمہ علم وادب کی طرف لوگوں کو متوجہ کرنے کے لیے اجتماعات اور سمیناروں کا اہتمام کیا جائے، اس کام کے لیے ریڈیو اور ٹی وی کی خدمات بھی حاصل کی جائیں۔

۱۴۔انفرادی سطح پر بھی اردو زبان کی بقاء وترویج کے لیے مختلف نوعیت سے کام کیا جاسکتا ہے جیسے اپنے بچوں کو اردو زبان سیکھنے کی طرف رغبت دلانا، گھر میں انگریزی کے بجائے اردو میں اخبارات پڑھنے کو رواج دینا، شادی کے دعوت نامے اردو میں چھپوانا، گھروں کے باہر انگریزی کے بجائے اردو میں نام کی تختی آویزاں کرنا وغیرہ۔

۱۵۔پرائیوٹ تعلیمی ادارے اردو زبان سے بہت کم ہم آہنگ ہوتے ہیں لہٰذا ان اداروں میں اردو مضمون کو کلیدی حیثیت ملنی چاہیے۔ بنیادی اور متوسط درجے کے تعلیمی اداروں میں اردو کو لازمی قرار دیا جائے اور حکومت کی طرف سے اردو میڈیم پرائیوٹ اسکول کھولنے کی مراعات دی جائے تاکہ انٹرپرینور ایسے ادارے کھولنے کی طرف راغب ہو۔

۱۶۔جے اینڈ کے پبلک سروس کمیشن کے امتحانات میں اردو زبان کے استعمال پر زور دیا جانا چاہیے اور پروفیشنل کورسز میں اردو کو ذریعہ تعلیم بنانے کے لیے ضروری اقدام کیے جانے چاہیے۔

۱۷۔ ریاست کے مختلف اضلاع، قصبوں اور شہروں میں پبلک اردو لائبریریاں قائم کی جائے جہاں اردو جرائد و مجلّات، بہترین علوم وفنون کی کتابیں، ملکی اور غیر ملکی اردو رسائل ہر وقت دستیاب ہو۔

۱۸۔ قومی سطح پر سمیناروں کا اہتمام ہونا چاہیے تاکہ ان میں شرکت کرنے والے اہلِ دانش اور محققین حضرات کے تجربوں اور تجاویز سے کسب فیض کر کے اردو زبان کی نشاۃ ثانیہ اور احیاء کا کام کیا جا سکے۔

۱۹۔ محکمہ اطلاعات کے ذریعہ ایک ایسا ہفتہ وار خبر نامہ منظر عام پر آنا چاہیے جو کثیر تعداد میں چھپ کر سرکاری کارکردگی اور ترقیاتی منصوبوں کی تفصیلات عوام تک پہنچانے کا فریضہ انجام دے سکے۔

۲۰۔ سرکاری دفاتر میں ٹائپسٹوں اور اسٹینوگرافرس کی تقرری کے لیے اردو ٹائپنگ اور اِن پیج جیسے سافٹ ویر کی واقفیت لازمی قرار دی جائے۔

۲۱۔ اردو کتابوں کی مارکیٹنگ ایک بنیادی مسئلہ ہے، ریاست میں لکھی جانے والی اردو کی اکثر کتابیں پست معیار اور طباعت، مواصلت اور کمیونی کیشن کی قلت کے سبب اس خطے تک ہی محدود رہتی ہیں، ان کتابوں کی وسیع پیمانہ پر اشاعت، وقت کی ایک اہم ضرورت ہے تاکہ ریاستی اصحاب قلم کی نگارشات اور علمی کارناموں سے پوری اردو دنیا مستفید ہو سکے۔

اردو زبان کو درپیش مسائل سے نکالنے، اس کی گتھی سلجھانے اور اس کی عظمت رفتہ کو بحال کرنے میں درجہ بدرجہ اقدامات نہایت تعمیر ساز اور اہم ثابت ہو سکتے ہیں، اگرچہ ان میں کئی تجاویز جہد پیہم اور صبر آزما کاوشوں کی متقاضی ہیں تاہم انھیں اس مقصد کے حصول میں ایک مشروط لائحہ عمل کی حیثیت سے دیکھا جانا چاہیے، اردو زبان اس وقت کروڑوں لوگوں کی باہمی مواصلت اور ترسیل کا ذریعہ ہے، اس زبان کے ساتھ ہندوستانی مسلمانوں کی تہذیب و ثقافت وابستہ ہے اور جہاں تک ریاست جموں و کشمیر کا تعلق ہے تو یہ اس خطہ کی سرکاری زبان کے ساتھ ساتھ اس کی مشترکہ تہذیب کی عکاس اور آئینہ دار ہے، اس نسبت کا ایک منطقی تقاضا یہ ہے کہ اس زبان کو نہ صرف سیاسی، انتظامی اور تعلیمی سطح پر بلکہ زندگی کے شعبہ جات میں وہ مقام عطا کیا جائے، جس کی یہ بجا طور پر حق دار اور

امیدوار ہے۔

حواشی

(۱)وادی چناب میں اردوزبان (مقالہ) از۔ڈاکٹر محمد اقبال:ص/ ۵۔۶۔(۲)جموں وکشمیر میں اردو: مہاراجاؤں کے دور سے مستقبل کے خدشات تک (مقالہ)۔ از ڈاکٹر مشتاق احمد وانی۔ص/ ۲۔(۳) کشمیر میں اردو: از عبدالقادر سروری۔ج/ ۲،ص/ ۱۰۶۔(۴) جموں وکشمیر میں اردو: مہاراجاؤں کے دور سے مستقبل کے خدشات تک (مقالہ)۔از ڈاکٹر مشتاق احمد وانی۔ص/ ۱۶۔(۵) حوالہ سابقہ۔ص/ ۶۔(۶) جموں وکشمیر میں اردو: مسائل ومستقبل (مقالہ) پروفیسر محبوبہ وانی۔ص/ ۷۔(۷) سہ ماہی فکر وتحقیق، ریاست جموں وکشمیر میں نئی اردو غزل کا منظر نامہ (مقالہ)۔از پریمی رومانی۔ص/ ۲۔(۸) جموں وکشمیر میں اردو: مہاراجاؤں کے دور سے مستقبل کے خدشات تک (مقالہ)۔از ڈاکٹر مشتاق احمد وانی۔ص/ ۱۰۔(۹) تواریخی اور لسانی حوالے سے جموں وکشمیر میں اردو کا منظر نامہ (مقالہ) از بلراج بخشی۔ص/ ۱۲۔(۱۰) ریاست جموں وکشمیر میں اردو کا مستقبل (مقالہ) از دیپک بدکی۔ص/ ۵۔(۱۱) ریاست جموں وکشمیر میں اردو بحیثیت سرکاری زبان۔(مقالہ) از پروفیسر نذیر احمد ملک۔ص/ ۸۔

مصادر ومراجع:

(۱) اردو زبان کی تاریخ۔ از خلیل احمد بیگ، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ۔

(۲) اردو زبان کی مختصر ترین تاریخ۔ از ڈاکٹر سلیم اختر، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس۔

(۳) جموں وکشمیر میں اردو ادب کی نشو ونما۔ از ڈاکٹر برج پریمی۔

(۴) کشمیر میں اردو، از پروفیسر عبدالقادر سروری، جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لنگویجز۔

(۵) مقدمہ تاریخ زبان اردو۔ از مسعود حسین خان، سرسید بک ڈپو، علی گڑھ۔

(۶) تاریخ ادب اردو۔ از جمیل جالبی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی۔

(۷) اردو زبان کی ابتداء اور ارتقاء کا مسئلہ، از مسعود حسین خان، فکر ونظر علی گڑھ۔

جمع وترتیب قرآن مجید

علامہ منّاع القطان کی ”مباحث فی علوم القرآن“ کے ایک باب ”جمع القرآن وترتیبہ“ کی تلخیص

فضل الرحمٰن اصلاحی

قرآن مجید کی جمع وترتیب: جمع قرآن کا اطلاق علما کے یہاں دو معنوں میں ہوتا ہے۔ایک یہ کہ اس کا مطلب قرآن کی حفاظت ہے۔قرآن مجید میں بعض آیات سے یہی ظاہر ہے مثلاً لا تحرک بہ لسانک لتعجل بہ ان علینا جمعہ و قرآنہ۔(القیامہ:۱٦۔۱۷)

حضرت ابن عباسؓ سے اس ذیل میں ایک روایت ہے کہ جب آیتوں کا نزول ہوتا تو نبی کریمؐ ان کو یاد کرنے کے لیے بڑا اہتمام فرماتے تھے اس کی شکل یہ ہوتی تھی کہ آپؐ اپنی زبان اور ہونٹ کو تیزی سے حرکت دیتے تھے تاکہ کوئی آیت بھولنے نہ پائے پس اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیات کا نزول فرمایا۔جمع قرآن کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ آیات وسور کو لکھ کر ایک صحیفہ میں جمع کرنا۔

عہد نبوی علیہ وسلم میں حفاظت قرآن: آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو وحی کا حد درجہ اشتیاق رہتا اور اس کے نزول کے مشتاقانہ منتظر رہتے، جب کوئی آیت نازل ہوتی تو آپؐ اسے زبانی یاد کرتے۔اس طرح آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قرآن مجید کے پہلے حافظ ہوئے۔قرآن مجید تقریباً ۲۳ برس میں نازل ہوا۔نزول کا طریقہ یہ رہا کہ کبھی ایک ہی آیت اور کبھی ایک سے زیادہ آیات نازل ہوئیں۔نزول کے سلسلے میں بخاری شریف میں چند روایات ہیں۔حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے، میں نے رسول اللہؐ کو فرماتے ہوئے سنا کہ قرآن مجید چار لوگوں سے سیکھو۔عبداللہ بن مسعود، سالم، معاذ بن جبل اور ابی بن کعب (رضی اللہ عنہم) سے۔ان میں دو مہاجر ہیں اور دو انصاری ہیں۔

اسکالر دار المصنّفین، شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ۔

حضرت قتادہؓ سے روایت ہے کہ میں نے انس بن مالکؓ سے پوچھا، عہد رسالت میں جمع قرآن کی ذمہ داری کس نے نبھائی۔ انہوں نے چار لوگوں کا نام لیا اور ان سب کا تعلق انصار سے ہے۔ ابی بن کعب، معاذ بن جبل، زید بن حارث اور ابوزید۔ جن کا نام قیس بن السکن ہے۔ صحابہ کرامؓ مذاکرۂ قرآن اور حفظ قرآن کے لیے حد درجہ مشتاق رہتے تھے۔ نبیؐ اس کے لیے حوصلہ افزائی فرماتے اور تعلیم قرآن کے لیے معلمین قرآن کا انتخاب فرماتے۔ حضرت عبادہ بن صامتؓ فرماتے ہیں کہ جب کوئی ہجرت کرتا تو نبیؐ ہم میں سے ایک آدمی اس کے حوالہ کر دیتے تاکہ وہ اسے قرآن سکھا سکے۔ لوگ جب مسجد نبویؐ میں قرآن کی تلاوت بلند آواز سے کرنے لگے تو آپؐ نے انہیں پست آواز میں قرآن پڑھنے کا حکم دیا۔ روایات بخاری وغیرہ کے تتبع سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کرامؓ نے پورے قرآن حکیم کو اپنے سینوں میں محفوظ کر لیا تھا اور اسے نبیؐ کے سامنے پڑھ کر پیش بھی کرتے تھے۔ یہ روایات متصل الاسناد ہیں۔

حفاظ کرام کی صحیح تعداد کا اندازہ لگانا مشکل ہے کیونکہ صحابہ کرامؓ مختلف بستیوں میں تھے۔ اس بارے میں بطور دلیل یہی کافی ہے کہ بئر معونہ کے موقع پر ۷۰ حفاظ صحابہ کرامؓ شہید کر دیے گئے تھے جن کو قرّاء کہا گیا۔ علامہ قرطبی کے مطابق اتنی ہی تعداد میں جنگ یمامہ میں بھی حفاظ صحابہ کرامؓ شہید ہوئے۔ ان روایتوں کے استقصاء سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد رسالت میں وہ حفاظ کرام کی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔

عہد رسالت میں جمع قرآن بشکل کتابت قرآن: رسول اللہؐ نے چند جلیل القدر صحابہ کرامؓ کو کاتبین وحی کی حیثیت سے متعین فرمایا تھا۔ مثلاً علیؓ، معاویہؓ، ابی بن کعبؓ اور زید بن ثابتؓ وغیرہ، جب بھی کوئی آیت نازل ہوتی اسے آپ لکھنے کا حکم دیتے اور ان کی رہنمائی اس سورہ کی آیت کی ترتیب کے ساتھ کرتے یعنی یہ آیتیں فلاں سورہ میں فلاں آیات کے بعد درج کریں۔ کتابت کا رواج اسی طرح جاری وساری ہوا۔ ابتداءً یہ بھی ہوا کہ بعض صحابہ کرام نے نبی کریمؐ کو بتائے بغیر قرآن مجید کو لکھنا شروع کر دیا تھا۔ قرآن مجید کی کتابت درختوں کی چھال، پتھر، کاغذ اور چمڑے کے ٹکڑوں پر ہونے لگی۔ حضرت زید بن ثابت فرماتے ہیں کہ ہم لوگ رسول اللہؐ کے پاس قرآن کو کاغذ کے ٹکڑے پر لکھتے تھے۔ معلوم ہوا کہ صحابہ کرامؓ نے کتابت قرآن کے سلسلے میں کیسی کیسی دشواریوں کا سامنا کیا،

جبکہ ان کے پاس کتابت کے سامان بھی پورے طور سے میسر نہ تھے۔ رمضان کی راتوں میں حضرت جبرئیل ہر سال نبیؐ سے قرآن کو سنتے سناتے اور یہی معمول صحابہ کرامؓ کا بھی تھا۔ عہد نبویؐ میں قرآن عام مصحف کی شکل میں جمع نہیں تھا۔ لیکن بعض اہل علم صحابہ حضرت علیؓ، معاذ ابن جبلؓ، ابی بن کعبؓ، زید بن ثابتؓ اور عبداللہ بن مسعودؓ ان کے اس عمل کو ''جمع القرآن فی عہد رسول اللہ'' کا نام دیا گیا۔

عہد ابوبکرؓ میں جمع قرآن: حضرت ابوبکرؓ خلیفہ ہوئے اور آپ کے عہد میں جنگ یمامہ ہوئی، جس میں ۷۰ حفاظ صحابہ کرام شہید ہو گئے۔ یہ مشہور واقعہ ہے کہ ایک دن حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکرؓ سے فرمایا کہ اگر اسی طرح حفاظ شہید ہوتے رہے تو مبادا کہیں قرآن مجید ضائع نہ ہو جائے۔ حضرت زید بن ثابتؓ کا بیان ہے کہ اس کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے مجھے ایک دن بلایا اور میرے سامنے جنگ یمامہ کے نتیجے میں ہونے والے خدشات رکھے اور حضرت عمرؓ نے اس سلسلے میں جو اندیشے ظاہر کیے ان کا تذکرہ فرمایا نیز جو کچھ حضرت عمرؓ سے اس بارے میں تبادلۂ خیال ہوا تھا اس کا اظہار فرمایا اور فرمایا کہ میں نے حضرت عمرؓ سے کہا کہ جو کام اللہ کے رسولؐ نے نہیں کیا اس کو کیسے انجام دیا جا سکتا لیکن عمرؓ اس کام کے لیے مسلسل مجھے آمادہ کرتے رہے یہاں تک کہ اس کام کے لیے اللہ تعالیٰ نے شرح صدر فرما دیا اور اس بارے میں سوچنے لگا جو حضرت عمرؓ نے سوچا تھا۔ پھر فرمایا کہ ''اے زید! تم ایک نوجوان عاقل شخص ہو میں تمہیں اس کے لیے مقرر کر رہا ہوں، کیونکہ تم رسول اللہؐ کی خدمت میں کتابت وحی کا کام کرتے تھے۔ پس تم قرآن کو ایک مصحف کی شکل میں جمع کر دو''۔

حضرت زید فرماتے ہیں کہ بخدا اگر مجھے پہاڑ منتقل کرنے کے لیے کہا جاتا تو یہ میرے لیے اتنا گراں نہ ہوتا۔ حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا یہ کام ہونا چاہیے اللہ تعالیٰ ہی بہترین کارساز ہے یعنی اس کام کا آغاز کر دو اللہ تعالیٰ ہی بہترین انجام تک پہنچائے گا۔ وہ اس کام کے لیے برابر مہمیز کرتے رہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے بھی حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کی طرح شرح صدر کی نعمت عطا فرمائی۔ حضرت زید بن ثابتؓ نے کمال احتیاط سے یہ فریضہ انجام دیا۔ ان کے علاوہ صحابہ کرامؓ کی ایک بڑی تعداد کو قرآن مجید زبانی یاد تھا۔ اس کے باوجود انھوں نے حفظ اور کتابت دونوں پر نظر رکھی۔ یعنی حضرت ابوبکرؓ پہلے شخص ہیں جنھوں نے قرآن مجید کو کمال احتیاط و اعتماد کے ساتھ جمع کیا۔ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ حضرت ابوبکرؓ کا اجر لوگوں میں سب سے بڑھ کر ہے کیونکہ انھوں سب سے پہلے قرآن مجید کو جمع

کیا۔اس عمل کوجمع ثانی کہا جاتا ہے۔

عہد عثمانی میں جمع قرآن: عہد عثمانی میں اسلامی فتوحات کا دائرہ وسیع ہوگیا اور حفاظ شہر در شہر پھیلنے لگے اور شہر کے لوگ انہیں لوگوں سے قرآن مجید کی قرأت اور اس کے الگ الگ پڑھنے کے انداز کو سیکھنے لگے، یہاں تک کہ قرآن مجید کے لب ولہجہ اور ادائیگی قرأت میں اختلاف نظر آنے لگا اور یہ اس رنگ کا تھا کہ فتنہ کا احساس ہونے لگا۔

روایت ہے کہ حضرت حذیفہ بن یمانؓ حضرت عثمانؓ کے پاس آئے اور حضرت حذیفہؓ لوگوں کے درمیان ہونے والے اختلاف قرأت سے متفکر تھے۔ چنانچہ انہوں نے ان سے عرض کیا کہ امت میں یہود ونصاریٰ جیسے اختلاف کے آثار ہیں تب حضرت عثمانؓ نے ایک مصحف جو مصحف ابوبکر تھا، اسے حضرت حفصہ سے لے کر حضرت زید بن ثابت، عبداللہ بن زبیر، سعید بن عاص اور عبدالرحمٰن بن حارث بن ہشام کی رہنمائی میں اس کی متعدد نقلیں تیار کرنے کی فرمائش کی۔

حضرت عثمانؓ نے یہ بھی فرمایا جب تم لوگوں اور حضرت زید میں قرآن کے کسی آیت کے تعلق سے کوئی اختلاف پیدا ہوجائے تو اسے اہل قریش کی زبان میں لکھو اس لیے کہ قرآن مجید ان کی زبان میں نازل ہوا ہے جب قرآن مجید کے متعدد نسخے اس انداز کے لکھ لیے گئے تو حضرت عثمانؓ نے اس مصحف کو مکمل ترین، معتمد ترین قرار دیا اور اب اس کے بعد دوسرے نسخوں کی ضرورت نہیں رہی۔

علامہ ابن جریر طبریؒ نے اسی لیے حضرت عثمانؓ کے اس زریں کارنامہ کے متعلق لکھا کہ انہوں نے امت کو ایک مصحف اور ایک قرأت پر جمع کیا، امت نے بھی اس کو پوری طرح قبول کیا، اس کے بعد ایک قرأت کے علاوہ بقیہ چھ قراتیں گویا متروک ہوگئیں۔

حضرت عثمانؓ اور حضرت ابوبکرؓ کے جمع قرآن میں فرق: حضرت ابوبکرؓ کا کارنامہ جمع قرآن کے سلسلہ میں یہ ہے کہ انہوں نے قرآن کو ضائع ہونے سے بچایا کیونکہ حاملین قرآن کی ایک بڑی تعداد شہید کردی گئی تھی۔ اور آیندہ اندیشہ تھا کہ کہیں اس طرح کے افراد کے شہید ہونے سے قرآن نہ ضائع ہوجائے اور حضرت عثمانؓ نے قرأت کے مختلف طریقوں کے درمیان ہونے والے اختلاف کو فرو کیا اور لوگوں کو ایک قرأت پر جمع کیا۔اس طرح حضرت عثمانؓ نے فتنہ کی جڑ کو کاٹ دیا اور مادۂ اختلاف ہی کو مٹادیا اور قرآن مجید کو مرور زمانہ کی تحریف سے محفوظ کردیا۔

اخبار علمیہ

”حرم کے بیس اہم مقامات کی نشان دہی“

حرمین شریفین کے نگراں ادارہ نے زائرین حرم کے لیے مسجد حرام میں مختلف مقامات پر ایسی تختیاں نصب کرنے کا فیصلہ کیا ہے جو عازم حج کو اپنے مطلوبہ بیس اہم مقام تک پہنچنے میں مدد کریں گی۔ مسجد حرام کے باہر لگی اسکرینوں پر بھی اس کی نشان دہی کی جائے گی اور یہ سہولت موبائیل فون پر بھی دستیاب ہوگی۔ ادارہ کے ڈائریکٹر جنرل سروز مشہور المغنی کے مطابق حاجیوں کو اپنے مطلوبہ دفتر تک رسائی میں مشکل پیش آتی ہے اور انہیں بار بار مطلوبہ مقام، دفتر یا ادارے کے بارے میں معلومات حاصل کرنا ہوتی ہیں۔ ان کی اسی دشواری کو پیش نظر رکھ کر یہ فیصلہ کیا گیا ہے۔ تختیوں میں جن مقامات کی نشان دہی کی جائے گی ان میں مسجد حرام کے داخلی اور خارجی دروازے برقی زینے، وہیل چیر حاصل کرنے کے دفتر، وہیل چیرز ٹریکس، خواتین اور مرد حضرات کے واش روم، امانتیں جمع کرنے کے دفتر، دارالافتاء، گم شدہ افراد کے بارے میں شکایات سیل وغیرہ کی نشان دہی کی جائے گی۔ (العربیہ ڈاٹ نٹ، ۲۶/ مارچ ۲۰۱۶ء)

”کاغذ میں دھاتی سیاہی کے استعمال کا آغاز کب ہوا؟“

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ کاغذ میں دھاتی سیاہی کا استعمال چوتھی صدی عیسوی میں شروع ہوا تھا۔ قدیم رومن شہر ہرکولینیئم میں پائے جانے والے کاغذ کے پلندے ۷۹ ویں صدی عیسوی میں آتش فشاں وسووینس کے پھٹنے سے زیر زمین دب گئے تھے۔ انہیں پڑھنے کی بہت کوشش کی گئی، کوشش کے دوران بعض برباد بھی ہوگئے لیکن فرانس کے شہر گوہنا بلا میں قائم یورپین سنگروٹرون کی ٹکنالوجی کی مدد سے اس کو پڑھنے کی کوشش کی گئی۔ (اس ٹکنالوجی میں استعمال کی جانے والی ایکسرے شعاعیں اسپتالوں میں استعمال کی جانے والی ایکسرے شعاعوں سے ۱۰۰ ارب درجے زیادہ روشن ہوتی ہیں) تو پتہ چلا کہ اس سیاہی میں سیسے کی کافی مقدار جان بوجھ کر استعمال کی گئی تھی، جس کا استعمال چار صدیوں بعد ہونا تھا۔ حالیہ انکشاف سے قبل سمجھا جاتا رہا ہے کہ مذکورہ مسودوں میں استعمال کی جانے والی سیاہی کاربن پر مشتمل تھی۔ اس سے وابستہ ڈاکٹر برن کا کہنا ہے کہ پیپائرس (قدیم زمانہ میں استعمال ہونے والی نباتاتی کاغذ کی قسم) پلندے کی سیاہی کے متعلق یہ دریافت ہمارے لیے نہ صرف تاریخی پہلوؤں سے دلچسپ ہے بلکہ ان کی تصویر کشی کے اعتبار

سے بھی دلچسپ ہے۔(بی بی سی اردو ۲۲/ مارچ بحوالہ پروسیڈنگز آف دی نیشنل اکیڈمی آف سائنسز)

''واٹرایڈ کی چشم کشا رپورٹ''

پانی اور حفظان صحت سے متعلق کام کرنے والی ایک بین الاقوامی غیر سرکاری تنظیم ''واٹرایڈ'' کے جائزے کے مطابق پاکستان میں تقریباً ایک کروڑ ۶۰ لاکھ افراد صاف پانی سے محروم ہیں۔اس سلسلہ میں ایک دلچسپ بات یہ بھی تحریر کی گئی ہے کہ اس صورت حال میں عدم مساوات کا بھی دخل ہے۔پاکستان ان پہلے دس ملکوں میں ہے جہاں غیر محفوظ ذرائع سے غیر معیاری پانی کے حصول کے علاوہ کوئی چارہ نہیں۔واٹرایڈ کے مطابق پاکستان میں ہر سال ۵۳ ہزار بچے گندے پانی سے پھیلنے والے مرض اسہال اور دیگر بیماریوں کے شکار ہوکر موت سے ہم آغوش ہوجاتے ہیں اور تیس لاکھ افراد گندے پانی سے پیدا ہونے والے امراض میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔آبی ذخائر اور پانی سے متعلق امور کے ماہر ارشد عباسی کا کہنا ہے کہ صاف پانی کی فراہمی کے بارے میں سرکاری سطح پر پالیسی سازی کا فقدان ہے اور حکومت پاکستان اس اہم مسئلہ کی سنجیدگی سے توجہ نہیں دے رہی ہے۔(تفصیلی رپورٹ راشٹریہ سہارا ۲۵/ مارچ میں دیکھی جاسکتی ہے)

''چینی نوجوانوں کی توہم پرستی کا عجیب وغریب گھناؤنا مظہر''

قدیم چینی پروہتوں کا بے بنیاد دعویٰ ہے کہ جو شخص مردہ لڑکی کو قبر سے نکال کر اس سے شادی رچائے گا اس کی زندگی پر چھائی تمام نحوستیں ختم ہوجائیں گی۔چینیوں کے اخلاق باختہ حقائق آئے دن منظر عام پر آتے رہتے ہیں۔یہ واقعہ بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔اس آواز پر ناپختہ ذہن نوجوانوں نے سب سے زیادہ توجہ کی اور چینی جریدہ باؤنیوز کے مطابق چین میں نوجوان لڑکیوں کی لاشیں نکال کر ان سے شادی کرنے کا رواج عام ہورہا ہے۔چینی خفیہ ذرائع کا کہنا ہے کہ چینی ریاست شانگ ژی میں یہ کاروبار عروج پر ہے اور قبرستان سے اب تک ۱۷ لڑکیوں کی لاشیں چوری کی جاچکی ہیں۔رپورٹ میں مزید کہا گیا ہے کہ متمول چینی خاندان ''بھوت شادیوں'' کے لیے مردہ خواتین کو حاصل کرنے کے لیے بھاری رقمیں پیش کررہے ہیں اور درجنوں چینی خاندانوں نے تازہ مرنے والی لڑکیوں کے عوض ایک لاکھ ڈالر تک وصول کیے ہیں۔شادیوں کی تفصیل کے سلسلہ میں لکھا گیا ہے کہ بیوٹی پارلر یعنی آرائش خانوں میں لے جاکر ان مردہ لڑکیوں کا مکمل میک اپ کیا جاتا ہے،ان کو شیشے کے تابوتوں یا قیمتی کھلے تابوتوں پر لٹا کر شادی کی جاتی ہے، نیا

لباس پہنایا جاتا ہے۔ پروہتوں کی جانب سے دولہا مردہ لڑکی کو انگوٹھی پہناتا ہے اور شادی کی رسم انجام پاتی ہے اور دولہا سمجھ لیتا ہے کہ اس کی زندگی سے اب نحوست رفو چکر ہوگئی اور خوش آیند مستقبل اس کے لیے چشم براہ ہے۔ یا للعجب۔ (تفصیل منصف، حیدرآباد ۶/ مارچ ۲۰۱۶ء میں دیکھی جاسکتی ہے)

''ایک غیر مسلم اسکالر کا اعتراف حقیقت''

بین الاقوامی تنظیم برائے روحانی بیداری کے صدر اور نامور ہندو اسکالر پنڈت این کے شرما نے پچھلے دنوں دہلی میں جمعیۃ اہل حدیث کانفرنس میں کہا کہ کوئی بھی مذہب بھید بھاؤ اور نفرت نہیں پھیلاتا۔ وہ دلوں کو جوڑنے کی تعلیم دیتا ہے۔ اسلام اور ہندومت کا بنیادی فلسفہ ہی یہی ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہندوستان میں جمہوری اقدار کے استحکام اور اس کی بحالی میں ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں نے برابر کا رول ادا کیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ مذہب کے نام پر انتشار پھیلانے اور اتحاد باہمی کی آواز کو کمزور کرنے والوں کی طرف توجہ کی ضرورت نہیں۔ آنحضورؐ کے متعلق شرما نے اپنی تقریر میں کہا کہ ہندومت کے لوگ بھی دل سے ان کی عزت و احترام کرتے ہیں اور ہندو مذہبی کتابوں میں اس عظیم الشان ہستی کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ انہوں نے داعش کے خلاف فتوی کی تحسین کرتے ہوئے کہا کہ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اسلام انتہا پسندی کے خلاف ہے۔ نقار خانے میں طوطی کی یہ آواز بسا غنیمت ہے۔ (اخبار مشرق کلکتہ ۱۶/ مارچ ۲۰۱۶ء)

''انوکھی میز''

پیرس سے تعلق رکھنے والے جین سبسٹیں لارینج نے رافیل مینارڈ کے ساتھ مل کر زیروانرجی فرنیچر ٹیبل (زی ای ایف ٹی) تیار کی ہے جو کسی بھی کمرے کا درجۂ حرارت تیار کرتی ہے۔ میز کی خصوصیت اس وجہ سے قابل ذکر ہے کہ یہ اے سی سے نجات دلا کر بجلی کے خرچ میں ۶۰ فیصد کمی کرتی ہے۔ اس کے نیچے ایسے اسباب و آلات لگائے گئے ہیں جو کمرے کا درجۂ حرارت ۱۷ ڈگری پر پہنچانے کے بعد اضافی حرارت کو اپنے اندر جذب کر لیتے ہیں اور پھر اسے المونیم کی مدد سے خارج کر کے کمرے کے ٹمپریچر میں نمایاں تبدیلی لے آتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ میز سردیوں میں کمرہ گرم رکھنے کی خصوصیت سے بھی متصف ہے۔ (ڈان نیوز، ۹/ مارچ ۲۰۱۶ء)

ک،ص اصلاحی

معارف کی ڈاک

”تہذیب قوم نوحؑ و ادریسؑ“

موضع سیورہ، پوسٹ منجھول
بیگوسرائے، بہار
۹/ ۳/ ۲۰۱۶ء

مکرمی! سلام مسنون امید کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔

معارف کے نومبر، دسمبر ۲۰۱۵ء اور جنوری ۲۰۱۶ء میں ”تہذیب قوم نوحؑ“ اور اس کے قبل والے شمارے میں ”تہذیب قوم ادریسؑ“ کے عنوان سے جناب محمد طارق غازی صاحب کے وقیع مقالات نظر نواز ہوئے اور میں ان سے اپنی علمی بساط کے مطابق مستفید ہوا۔ ان میں پیش کردہ ایک آیت کے سلسلے میں یہ چند عامیانہ سطریں پیش خدمت ہیں۔

”واذا اردنا ان نهلک قرية امرنا مترفيها ففسقوا فيها فحق عليها القول فدمرناها تدميرا“۔ اس آیت میں ”امرنا“ کا ترجمہ اکثر مفسرین وہی کرتے ہیں جو موصوف نے بھی کیا ہے۔ لیکن مولانا عبدالسلام ندویؒ نے اسوۂ صحابہ میں اس کا ترجمہ ”اکثرنا“ کیا ہے، جس کا مفہوم یہ ہوجاتا ہے ”جب ہم کسی گاؤں کو ہلاک کرنا چاہتے ہیں تو کثرت سے اس میں امراء کو پیدا کردیتے ہیں اور ذی ثروت کی کثرت فسق و فجور کی شیوعیت وعمومیت کو منتج ہوتی ہے تب پھر ہماری حجت پوری ہوجاتی ہے اور نتیجتاً ہلاکت اس کا مقدر ہوجاتا ہے“۔

متذکرہ کتاب کی عدم موجودگی کے باعث دلیل واستناد کی پیش کش سے خود کو قاصر پاتا ہوں۔ اور یہ جو کچھ بھی پیش کیا ہے وہ اس کے مطالعے کے بعد میرے حافظہ میں محفوظ رہ جانے والے حاصل مطالعہ کی روشنی میں۔ تاہم کوشش جاری ہے کہ اس کو حاصل کرکے پھر اس مسئلے کو اس کے مالہ وماعلیہ کے ساتھ پیش کروں۔ تب تک اپنی اس بے بسی و بے کسی کے اظہار کے لیے یہ شعر پیش کرتا ہوں۔

اب یاد رفتگاں کی بھی ہمت نہیں رہی یاروں نے کتنی دور بسائی ہیں بستیاں

کہنے کی ضرورت نہیں کہ موصوف کی یہ دونوں نگارشات قرآنیات سے لگاؤ رکھنے والوں کے لیے خصوصاً علم وفن سے اشتغال رکھنے والوں کے لیے قابل قدر تحفہ ہیں۔ نیز قرآن کریم کی تعریف کے ایک جزء ''الذی لا تنقضی عجائبه و غرائبه'' کا مصداق ہے۔ ''اللہ کرے زور قلم اور زیادہ''۔ فقط

خلوص کیش

(جناب) راجو خان

معارف کا ڈاک ٹکٹ

شفی دواخانہ (مطب حکیم ضیاء الدین)
سبزی منڈی، چوک، الہ آباد ۲۱۱۰۰۳
۲۱/۳/۱۶ء

مکرمی ایڈیٹر ماہنامہ ''معارف'' سلام مسنون!

آج ماہ مارچ کا معارف ملا۔ پڑھ کر خوشی ہوئی معارف کا سواں سال جون میں پورا ہونے والا ہے۔ ابھی شبلی صدی تقریبات کا سلسلہ ختم ہوا اور دوسرا مرحلہ آ گیا۔ اس سے قبل بھی آپ کو خط لکھا گیا تھا، ناچیز نے کچھ مشورہ دیا تھا لیکن نہ تو خط کا جواب آیا اور نہ ہی کوئی دعوت نامہ موصول ہوا، جبکہ والد مرحوم کا تعلق دارالمصنّفین سے تھا بہرحال ایک مشورہ ہے کہ اس موقع پر کوئی Ministry of Post & Telegraph سے رابطہ کر کے ایک ڈاک ٹکٹ جاری کرائیں، جبکہ معمولی معمولی میگزین اور الگ الگ کالج اور اداروں کا ٹکٹ جاری ہوا ہے۔ پھر اس کا کیوں نہیں ہوسکتا۔ حکومت سے کہنے میں کیا مشکل ہے۔ ورنہ مجھے اجازت دیں تو یہ کام میں خود کروں، کیونکہ میں اس Philatelic Club کا ممبر ہوں۔ بس آپ کو ایک لیٹر بنا کر روانہ کرنا ہوگا۔ میگزین معارف کے پرانے شمارہ کی کاپی جارہی ہے یہ کیسا معارف ہے؟(۱)

ادارہ کے تعلق سے کچھ تصویریں روانہ کررہا ہوں، خط کے جواب کا انتظار رہے گا۔

فقط والسلام

(جناب) حکیم رشاد الاسلام

---

(۱) یہ وہی مشہور رسالہ ہے جو وحید الدین سلیم کی ادارت میں علی گڑھ سے ۱۸۹۸ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کی عکسی تصویر کے لیے بہت بہت شکریہ۔ (معارف)

قتل عمد میں معافی اور.....

پھلواری شریف،

پٹنہ

۲۳/ ۳/ ۱۶ء

محترم ومکرم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

معارف کے جنوری، فروری اور مارچ ۲۰۱۶ء کے تین شماروں میں میرا مضمون "قتل عمد میں معافی اور امت کا موقف" شائع ہوا۔ یہ آپ حضرات کی عنایت ہے جس کے لیے میں شکر گزار ہوں۔ مختلف اہل علم کی طرف سے مضمون کی پسندیدگی کی خبریں مل رہی ہیں۔

تیسرے شمارے میں کمپوزنگ کی غلطی سے مضمون کی ایک سطر چھوٹ گئی ہے۔ جس سے عبارت غیر واضح ہوگئی ہے۔ اس کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے۔ معارف میں یہ ہے:

"اسی طرح اگر کسی کے ہاتھ کاٹنے کا ارادہ ہو مگر گردن کٹ گئی تو عمد (۱۰۷) لگ گیا تو وہ قتل عمد ہے"۔ (معارف مارچ ۱۶ء، ص ۱۶۸، ۱۶۹)

پوری عبارت اس طرح ہے:

"اسی طرح اگر کسی کے ہاتھ کاٹنے کا ارادہ ہو مگر گردن کٹ گئی تو وہ بھی قتل عمد ہے۔ لو أراد يد رجل فأصاب عنقه فهو عمد (۱۰۷) ترجمہ: اگر کسی شخص کے ہاتھ کاٹنے کا ارادہ کیا اور گردن پر لگ گیا تو وہ قتل عمد ہے"۔

مناسب سمجھیں تو اس وضاحت کو اگلے شمارے میں شائع فرمادیں۔ شکر گزار ہوں گا۔

والسلام

(مولانا) بدر احمد مجیبی

ادبیات

مدفن

انس مسرورؔ انصاری

کسی کا بھائی کسی کا پیارا کسی کا لخت جگر دُلارا
زمیں کے نیچے پڑا ہوا ہے گھنے اندھیروں میں بے سہارا
سوائے حشرات الارض کے اب نہیں ہے پرسان حال کوئی
گداز باہوں کا لمس شیریں نہ دل کشی جمال کوئی

تمام عظمت، غرور ونخوت پڑی ہوئی مشت خاک میں ہے
بدن کہ ناز و نعم کا پروردہ حالت خوفناک میں ہے
نہ جاہ و حشمت نہ شان و شوکت نہ سطوت و اقتدار باقی
عمل نہ حرکت نہ خیر و برکت نہ ان پہ کچھ اختیار باقی

کھنکتے سکوں پہ رقص کرتی حیات نا پائیدار دیکھے
نکل کے عشرت کدے سے آئے عروس لیل و نہار دیکھے
نہ چارہ گر ہیں نہ چارہ سازی نہ دوستوں کی وہ دل نوازی
نہ حسن کی ہے فسوں طرازی نہ سر بلندی نہ سرفرازی

قبائے زر تار جسم نازک اور اس پہ آرائشیں بلا کی
مگر یہ عالم ہے اب کہ عریاں بدن کی تقدیر فرش خاکی
عمل کے نامہ میں درج عصیاں کی حد نہ کوئی حساب لوگو
بس اک حقیقت سوال تنہا، جواب ہیں سب سراب لوگو

کسی کا بھائی کسی کا پیارا نہ کوئی لخت جگر کسی کا
یہ رشتے ناطے سب عارضی ہیں کوئی نہیں چارہ گر کسی کا
کہاں ہے وہ دوستوں کا جمگھٹ وہ منچلے، شوخ وشنگ، نٹ کھٹ
شریر آنکھوں کے آئینوں میں چمکتے خوابوں کی جھلملاہٹ

حریر و اطلس کی زر فشاں قیمتی قبائیں تو یاد ہوں گی
نزاکتیں جن پہ ختم ہوتی ہیں وہ ادائیں تو یاد ہوں گی

سکراول، اردو بازار، ٹانڈہ امبیڈکر نگر ۲۲۴۱۹۰۔

مطبوعات جدیدہ

زندگی میری: مترجم ڈاکٹر محمد عارف الدین فاروقی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۲۷۲، قیمت: ۲۵۰/روپے، پتہ: البلاغ پبلی کیشنز، این-۱، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵۔

عربی زبان وادب سے تعلق رکھنے والوں کے لیے احمد امین کے نام وکام کو کسی تعارف کی ضرورت نہیں، اردو میں بھی وہ طٰہٰ حسین اور حسین ہیکل کی طرح یا ان سے کچھ زیادہ ہی معروف ومقبول ہیں۔ اس مقبولیت میں ان کی فجر الاسلام اور ضحیٰ الاسلام جیسی کتابوں کا بڑا حصہ ہے۔ وہ گذشتہ عیسوی صدی کے نصف اول کی ان شخصیات میں ہیں جن کا دائرۂ اثر ملک و ماحول تک محدود نہیں رہا۔ انقلابات وتغیرات کی کرشمہ سازیوں کے لحاظ سے بیسویں صدی کا یہ زمانہ بھی عجیب ہے، افکار و نظریات کی ہیجانی یلغار نے خاص طور پر مشرق کے افلاک وآفاق کو جس طرح غبار آلود کیا وہ بھی حیرت انگیز اور اس کے بعد مطلع جب صاف ہونے لگا تو نئی روشنی میں روایت، قدامت، جدت و جدیدیت کے معانی بھی کچھ سے کچھ نظر آنے لگے، جس کے نتیجہ میں اجتماعی وانفرادی دونوں طرح اثبات ونفی کی زیادہ مستحکم شکلیں سامنے آئیں۔ برصغیر نے اس دوران جیسی شکلیں پیش کیں قریب اسی طرح عرب دنیا اور اس میں بھی مصر خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ احمد امین کی زندگی بھی ایک نمونہ ہے جس میں بچپن سے آخر عمر تک ہر لمحہ وقت کی گردش کی لکیریں ابھرتی اور مٹتی رہیں۔ یہ احمد امین کی سچی عالمانہ سوچ ہے کہ اپنی زندگی کی داستان سنانے کا حق صرف ان ہی کو نہیں جو اعلیٰ عہدوں، مہم جوئیوں، اور قیادت واصلاح کے میدانوں میں نظر آتے ہیں۔ اپنے ماحول میں ہر لمحہ تجربات سے دوچار ہونے والے گم ناموں کی زندگی بھی کبھی کبھی مشاہیر کی طرح اہم بن جاتی ہے، گو یہ سوچ احمد امین کے انکسار و فروتنی کا اظہار ہے لیکن ان کی شخصیت میں ان کے والدین، معاشرتی ومعاشی زندگی وغیرہ یہ ثابت کرتی ہے کہ بظاہر انسانوں کی ایک جیسی زندگی، دوسرے زاویہ نظر سے کتنی مختلف اور متضاد بھی ہوجاتی ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یا ابہام کی توضیح ان کی خودنوشت ”حیاتی“ ہے۔ جہاں نسل اور خاندان سے ایک انسان کی ابتدا ہوتی ہے جو اس وقت تک ناقابل فہم رہتی ہے جب تک کہ وہ اپنی انتہا کو نہ پہنچ

جائے۔ انھوں نے سچ کہا کہ ازہر وغیرہ تعلیم گاہوں کی اہمیت اپنی جگہ لیکن زندگی کے سب سے اہم سبق وہ ہوتے ہیں جن کی جگہ، انسان کا اپنا گھر ہوتا ہے۔ یہ گھر جس طرح تبدیل حالات کا آئینہ بنتے ہیں اس کی حقیقت یہی ہے کہ وقت کے ساتھ ناگوار باتیں گوارا اور کتنی نامانوس چیزیں مانوس ہوتی جاتی ہیں۔ وہ محلے جو کبھی طبقاتی طرز پر وجود میں آتے تھے کہ وقت کا تقاضہ بھی تھا اب ان کی جگہ وہ طرز ہے جہاں اہل معاملہ سے ربط ضبط خصوصاً معاشرتی تعلقات کی گنجائش بھی نظر نہیں آتی۔ تعلیم کے بعد حصول معاش کی منزلوں تک انسان کہاں کہاں سے گزرتا ہے۔ احمد امین نے محسوس کیا کہ ''علم اور چیز ہے اور عمل اور چیز''۔ ازدواجی زندگی کی کہانی کا خلاصہ بھی ان کے لفظوں میں یہی نکلا کہ راحت وسلامتی چاہیے تو عورت کے جذبات کی رعایت ہی سب سے اچھا اصول ہے۔ حالات جب معمول پر آجائیں تو اس وقت اپنی ناراضی کا اظہار زیادہ مناسب ہے۔ مدرسہ اور یونیورسٹی میں فرق ان کے تجربہ نے یہ ظاہر کیا کہ مدرسہ میں کتابیں پڑھائی جاتی ہیں اور یونیورسٹی میں اس لیے پڑھی جاتی ہیں کہ کوئی نئی کتاب لکھی جائے۔ یعنی ایک حصول علم کا ذریعہ تو دوسرا علم کے پوشیدہ گوشوں کو سامنے لانے کا ذریعہ، یہ احمد امین کا اپنا تجربہ ہے۔ جس کے مستقل اور ناقابل تغیر ہونے کا حکم نہیں لگایا جاسکتا۔ انھوں نے ترکی کا سفر کیا، اس کی روداد بہت دلچسپ ہے اتنی کہ ایک کہانی کیا بقول مصنف کئی کہانیوں کا پلاٹ بن سکتا ہے۔ جس میں ایک مقام ''تکلیف دہ عزت افزائی'' کا ہے، یہ کیا ہے اس سے لطف اندوز ہونے کے لیے اصل مضمون ہی دیکھنا چاہیے۔ انھوں نے عراق میں شیعہ سنی اختلاف کی آفتوں کا ذکر کیا کہ ان سے صلاحیتیں اور توانائیاں ضائع ہورہی ہیں، ان کا یہ کہنا بہتوں کے لیے معقول ہوگا کہ حضرت علیؓ ومعاویہؓ کے گروہوں کا نزاع ان حضرات کے عہد تک یا اس سے متصل زمانہ تک تو سمجھ میں آتا ہے، اب جبکہ امامت وخلافت کا تنازعہ ہی باقی نہیں تو پھر اس کی معقولیت کو کیسے تسلیم کیا جائے۔ جب ان کی والدہ کا انتقال ہوا تو ان کے صبر نے یوں تلقین کی کہ ''کیا ہم اپنے آباء واجداد کا نیا روپ نہیں ہیں جو ہم ہی میں رہتے ہیں، جو ہمارے جسم وجاں میں جذب ہیں'' اور جب خود ان کی زندگی، انتہا تک پہنچنے لگی تو کھلا کہ جن قدروں کو کبھی بہت پائیدار سمجھا وہ تو بودی نکلیں، اصل نوازش اللہ کی ہے اور یہ مزاج میں سکون وطمانیت کی نعمت ہے۔ حیاتی صرف احمد امین کی زندگی ہی نہیں ان کے بے شمار پڑھنے والوں کی زندگی کا احساس بھی ہے۔ ایسی مفید کتاب کا حق تھا

کہ اس کا فائدہ عام کیا جائے اور اس حق کو مترجم جناب فاروقی نے خوب ادا کیا۔ ترجمہ میں سلاست اور روانی ہے، کہیں کہیں کچھ ٹھوکر لگتی ہے تو اس کی وجہ خود مترجم نے بیان کردی کہ انہوں نے عربی اسلوب کو رعایت لفظی کے ساتھ ڈھالنے کی کوشش کی ہے کہ اصل کا لطف آجائے۔ انہوں نے مانا کہ حیاتی کا ترجمہ اور بھی ہوا لیکن انہوں نے جس طرح ذیلی عنوانات اور حواشی وغیرہ دیے، اس سے ''زندگی میری'' کی افادیت اور بڑھ گئی۔ ترجمہ میں حیدرآبادی لہجہ بھی نمایاں ہے جو اس سے آشنا لوگوں کے لیے اور بھی لطف دے جاتا ہے۔

اصحاب کہف کے غار کا انکشاف: از پروفیسر محمد نعمان خاں، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۲۶۴، قیمت: ۱۵۰/روپے، پتہ: اسلامک بک فاؤنڈیشن ۱۷۸۱، حوض سوئی والان، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲۔

سورۂ کہف کے بارے میں متعدد حدیثیں موجود ہیں جو اس سورہ کے مضامین کی اہمیت کی وجہ سے اس کی فضیلت و برکت خصوصاً فتنۂ دجال سے حفاظت کو بیان کرتی ہیں۔ اس سورہ میں اگرچہ خضر و موسیٰ، ذوالقرنین اور باغ والوں کے واقعات بھی ہیں لیکن غار والوں یعنی اصحاب کہف کی نسبت سے سورہ کا تعارف ہوتا ہے۔ ایک وجہ یہ بھی ممکن ہے کہ چونکہ اصحاب کہف کا ذکر سب سے پہلے ہے، اس لیے سورہ کو ان سے موسوم کیا گیا۔ زیر نظر کتاب اس لحاظ سے بہت دلچسپ اور پراز معلومات ہے کہ اس میں اصحاب کہف کے غار کی اس تلاش و دریافت کا بیان ہے جس کو بیسویں صدی کے عظیم کارنامہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ فاضل و محقق مصنف نے اس کے لیے جن اردنی محققوں کی معلومات اور نتائج تحقیق کو اپنا ماخذ بنایا ان میں سے ایک تیسیر ظبیان ہیں جن کے متعلق کہا گیا کہ وہ پہلے شخص ہیں جو اس غار تک پہنچے۔ اس غار سے دنیا کو واقف کرایا اور اسی غار کے علاقہ میں ضاحیۃ الکہف کے نام سے ایک بستی بھی بسا گئے اور اس طرح یہ متعین کر گئے کہ اصحاب کہف کی پناہ گاہ ترکی کی ایک بستی افسوس یا افیسس نہیں بلکہ یہ عمان اردن کے مضافات میں ہے۔ کتاب کا اصل مقصد تازہ ترین انکشاف حقیقت سے باخبر کرنا تھا لیکن لائق مصنف نے اصحاب کہف کے بارے میں عیسائی و اسلامی روایات، اس پہاڑ کا بیان جہاں یہ غار واقع ہے اور پھر اس کے متعلق تمام دلائل و قرائن، تاریخی روایات، سب کا احاطہ کرلیا اور ضمیمے کے طور پر اصحاب کہف کے متعلق برصغیر کے بعض علماء کے مضامین

کو بھی اس میں شامل کردیا مثلاً مولانا آزاد، مولانا عبدالرشید نعمانی، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی، مولانا مودودی، مفتی محمد شفیع اور مولانا احمد رضا خاں کی تحریروں اور تفسیری حواشی سب نے اس بحث کو اور وقیع ومفید بنادیا۔اس کے علاوہ غار کی بڑی قیمتی اور نادر تصویریں بھی ہیں، اس طرح اصحاب کہف کے متعلق پہلی بار قدیم وجدید معلومات یکجا طور پر سامنے آگئے۔افسوس ہے کہ اس نہایت دلچسپ کتاب کا ذکر کافی تاخیر سے ان صفحات میں آپایا۔ہم اس کے لیے مصنف سے معذرت خواہ ہیں اور شاید معذرت خواہی کا یہ عمل دوسری ایسی ہزاروں کتابوں کے لیے بھی ہے جو تبصرہ وتذکرہ کی منتظر ہیں۔معارف کی تنگ دامانی پیش نظر رہے تو شاید عذر قابل قبول ہوجائے۔

مسلم مجلس مشاورت، ایک مختصر تاریخ: از جناب محمد علم اللہ، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، صفحات ۲۰۰، قیمت: ۲۰۰/روپے، پتہ: فاروس میڈیا اینڈ پبلشنگ پرائیویٹ لمٹیڈ، ڈی-۸۴، ابوالفضل انکلیو-۱، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵۔

۱۹۴۷ء میں ہندوستان کی آزادی کے اعلان کے بعد کم ازکم مسلمانوں کو ایسے حالات سے مسلسل گزرنا پڑا، جس میں یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ آزادی واقعی نعمت ہے یا کچھ اور؟ ۶۰ء آتے آتے سیکولر اور جمہوری ہندوستان میں مسلمانوں کے لیے حالات بد سے بدتر ہونے لگے۔درد حد سے بڑھا تو درماں کی تلاش ہوئی اور اسی تلاش کی ایک شکل مسلم مجلس مشاورت تھی۔جس نے مسلمانوں کی مختلف تنظیموں اور جماعتوں کو متحد الخیال اور متحد العمل ہونے کا پیغام دیا اور موقع بھی۔بے چاروں کے لیے مشاورت ایک بشارت تھی، اس لیے امت کی جانب سے اس کا خیر مقدم بھی ایسا ہوا کہ جس کو تاریخی کہا گیا لیکن پھر خدا جانے کیا ہوا کہ یہ پھول بہار جاں فزا پیش کرنے سے پہلے ہی مرجھا گیا۔ اس کے اسباب وعوامل پر بہت کچھ لکھا گیا جو قصہ ماضی کی طرح فراموش بھی کردیا گیا، اتنا ضرور ہوا کہ اس کے نام ونشان کو کچھ لوگوں نے مٹنے نہیں دیا، کسی نہ کسی شکل میں اس کے تن مردہ میں جان ڈالنے کی کوششیں بھی ہوتی رہیں۔ ۲۰۱۴ء میں مشاورت کے قیام کے پچاس سال مکمل ہوئے تو ضرورت ہوئی کہ ایک بار پھر اس کی زندگی کا جائزہ لیا جائے، پچاس سال میں کہاں کہاں موڑ آئے، منزل کتنی دور رہی یا پاس آکر گزر گئی؟ اور کیا پھر سے یہ غور کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ موجودہ دور میں اس کا احیاء اس لیے کیا جائے کہ ملت اسلامیہ ہندیہ کے مستقبل کی تعمیر میں مشاورت سب سے

زیادہ کارآمد ثابت ہوسکتی ہے۔ یہ کتاب اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ اس میں صرف مشاورت کے قیام اور اس کے بعد کے ''کومائی'' وجود پر محققانہ ومتوازن معلومات ہیں بلکہ اس میں بڑی دردمندی سے شعوری نصب العین، عزم و استقامت اور اجتماعیت کی دہائی دی گئی ہے۔ اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف کی عمر زیادہ نہیں لیکن انہوں نے جس احتیاط و دیانت ومتانت سے یہ کتاب مرتب کی ہے وہ قابل تعریف ہے۔ ہندوستان کی مسلم سیاست سے تعلق رکھنے والی نوجوان نسل کو یہ کتاب ضرور دیکھنا چاہیے، کیونکہ ان کے لیے ایک پیغام ہے جس کے ذریعہ ایک مستحکم ملی قیادت کا خواب شرمندۂ تعبیر ہوسکتا ہے۔

دانش کدہ: از جناب دانش فراہی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۲۱۶، قیمت: ۱۵۰/روپے، پتہ: ریاض احمد فراہی، رام لیلا میدان، سرائے میر، اعظم گڑھ، بدر بک ڈپو، سرائے میر، اعظم گڑھ اور سرائے میر و دہلی کے معروف مکتبے۔

دانش فراہی اعظم گڑھ کی شعری روایات کے نہایت قیمتی سلسلہ کی ایک تازہ کڑی ہیں۔ وہ ماضی قریب کے نہایت خوش فکر، خوش گو اور خوش گلو بزرگ شاعر اختر مسلمی سے کئی نسبتیں رکھتے ہیں، جن کا اثر خود ان کی شاعری پر نمایاں ہے۔ یہ ان کا غالباً پہلا شعری مجموعہ ہے جس میں سو سے زیادہ غزلیں اور نظمیں ہیں۔ ان کے لیے عموماً جن بحروں کا انتخاب کیا گیا ہے بقول مولانا عمر اسلم اصلاحی ''وہ سب بجتی اور گنگناتی بحریں ہیں''۔ حقیقت بھی یہی ہے۔

دل مرا صاف آئینہ کی طرح　　ایک سادہ کتاب ہے یارو
میں ہوں ناکام عشق میں لیکن　　کیا کوئی کامیاب ہے یارو
مت پوچھو کیا دل پر گذری　　چہرہ اترا دیکھا اس کا

ایسے اشعار کسی بھی شعری مجموعہ کو قابل مبارک باد بنا سکتے ہیں، یہاں تو ملک زادہ منظور صاحب کی یہ سند بھی ہے کہ ''دانش کے کلام میں روایت کے صنم کدوں کا نور ہے اور مقدس آتش خانوں کی آنچ بھی''۔ دانش کے دانش کدہ کا رخ احترام واہتمام سے کیا جاسکتا ہے۔

ع-ص

رسید کتب موصولہ

۱۔ارمغان فانی: مولانا نوراللہ نوروز یرستانی، القاسم اکیڈمی، جامعہ ابوہریرہ، خالق آباد، نوشہرہ پاکستان۔ قیمت: درج نہیں

۲۔امام مالک اوران کی کتاب موطا کا مقام: تالیف مولانا تقی الدین ندوی، مترجم مولانا فیروز اختر ندوی، مرکز الشیخ ابی الحسن الندوی، جامعہ اسلامیہ مظفر پور، اعظم گڑھ۔

قیمت: ۲۰۰/روپے

۳۔تفہیم غالب کے مدارج: ڈاکٹر شمس بدایونی، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی۔

قیمت: ۲۵۰/روپے

۴۔حافظ ملت ــ ارباب علم ودانش کی نظر میں: ترتیب وتدوین محمد طفیل احمد مصباحی، تنظیم ابنائے اشرفیہ مبارک پور، اعظم گڑھ۔ قیمت: ۸۰/روپے

۵۔حیات شیخ الاسلام: ڈاکٹر سید شاہ حسین احمد، ارم پبلشنگ ہاؤس، دریاپور، پٹنہ۔

قیمت: ۲۰۰/روپے

۶۔شریعت میں عرف کا اعتبار اور اس کے حدود وقیود: محمد مصعب، مکتبۃ النور، دیوبند۔

قیمت: درج نہیں

۷۔غالب کے فارسی خطوط: پروفیسر حنیف نقوی، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی۔

قیمت: ۱۵۰/روپے

۸۔موبائل فون کے ضروری مسائل: محمد طفیل احمد مصباحی، سنی پبلیکیشنز، وحید مارکیٹ، جامع مسجد، دہلی۔ قیمت: ۱۲۵/روپے

۹۔نشان اجمل: مولفین حکیم محمد فضیل، حکیم فخر عالم، البلاغ پبلیکیشنز، دہلی۔ قیمت: ۴۰۰/روپے

۱۰۔ہندوستان میں عربی زبان وادب کا فروغ، مختصر تعارف اور تجزیہ (حصہ اول): پروفیسر شبیر احمد ندوی، ماڈرن ایج اسلامک لٹریری اینڈ کلچرل ریسرچ سنٹر، 529Ka/331، متین پوروہ، خرم نگر، لکھنؤ۔ قیمت: ۲۵۰/روپے

تصانیف علامہ شبلی نعمانیؒ

کتاب	قیمت
سیرۃ النبیؐ جلد اول و دوم (یادگار ایڈیشن)	2000/-
سیرۃ النبیؐ	
(خاص ایڈیشن مکمل سیٹ ۷ جلدیں)	2200/-
علامہ شبلی و سید سلیمان ندوی	
مقدمہ سیرۃ النبیؐ	30/-
الفاروق	300/-
الغزالی	200/-
المامون	100/-
سیرۃ النعمان	300/-
سوانح مولانا روم	80/-
شعر العجم اول	150/-
شعر العجم دوم	130/-
شعر العجم سوم	125/-
شعر العجم چہارم	150/-
شعر العجم پنجم	120/-
الانتقاد علی تاریخ التمدن الاسلامی	350/-
(محقق ایڈیشن) تحقیق: ڈاکٹر محمد اجمل ایوب اصلاحی	
الکلام	230/-
علم الکلام	180/-

کتاب		قیمت
موازنہ انیس و دبیر		100/-
اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر		85/-
سفرنامہ روم و مصر و شام		200/-
کلیات شبلی (اردو)		180/-
کلیات شبلی (فارسی)		45/-
مقالات شبلی اول (مذہبی)		100/-
مرتبہ: سید سلیمان ندوی		
مقالات شبلی دوم (ادبی)	〃	70/-
مقالات شبلی سوم (تعلیمی)	〃	80/-
مقالات شبلی چہارم (تنقیدی)	〃	200/-
مقالات شبلی پنجم (سوانحی)	〃	150/-
مقالات شبلی ششم (تاریخی)	〃	90/-
مقالات شبلی ہفتم (فلسفیانہ)	〃	100/-
مقالات شبلی ہشتم (قومی و اخباری)	〃	110/-
خطبات شبلی	مرتبہ: عبدالسلام ندوی	80/-
انتخابات شبلی	مرتبہ: سید سلیمان ندوی	45/-
مکاتیب شبلی اول	〃	150/-
مکاتیب شبلی دوم	〃	190/-
شذرات شبلی	مرتبہ: ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی	220/-

ISSN 0974 - 7346 MA'ARIF (URDU) -PRINT
APRIL 2016 Vol- 197 (4)
RNI. 13667/57 **MA'ARIF** AZM/NP- 43/016
Monthly Journal of
DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY
P.O.Box No: 19, Shibli Road, AZAMGARH, 276001 U.P. (INDIA)
Email: shibli_academy@rediffmail.com, info@shibliacademy.org
Website: www.shibliacademy.org Fax No: 05462 - 265080
Bank Name: Punjab National Bank - Heerapatti, Azamgarh
Account No: 4761005500000051 - IFSC No: PUNB0476100
(Office Mobile) 07607046300 / 09170060782

تصانیف و مطبوعات شبلی صدی تقریبات

نمبر	کتاب		مصنف	قیمت
۱۔	سیرۃ النبیؐ جلد اول و دوم (یادگار ایڈیشن)		علامہ شبلی نعمانی	2000/-
۲۔	شبلی کی آپ بیتی		ڈاکٹر خالد ندیم	325/-
۳۔	دارالمصنّفین کے سو سال		کلیم صفات اصلاحی	350/-
۴۔	شذرات شبلی (الندوہ کے شذرات)		مرتبہ: ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی	220/-
۵۔	الانتقاد علی تاریخ التمدن الاسلامی		علامہ شبلی نعمانی تحقیق: ڈاکٹر محمد اجمل ایوب اصلاحی	350/-
۶۔	محمد شبلی لائف اینڈ کنٹری بیوشنس		ڈاکٹر جاوید علی خاں	230/-
۷۔	سیرت عائشہ	(ہندی ترجمہ)	علامہ سید سلیمان ندوی	325/-
۸۔	عرب و ہند کے تعلقات	(ہندی ترجمہ)	// //	200/-
۹۔	خطبات مدراس	(ہندی ترجمہ)	// //	125/-
۱۰۔	دین رحمت	(ہندی ترجمہ)	مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی	200/-
۱۱۔	ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری، اول	(ہندی ترجمہ)	سید صباح الدین عبدالرحمن	125/-
۱۲۔	ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری، دوم	(ہندی ترجمہ)	// //	180/-
۱۳۔	ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری، سوم	(ہندی ترجمہ)	// //	225/-